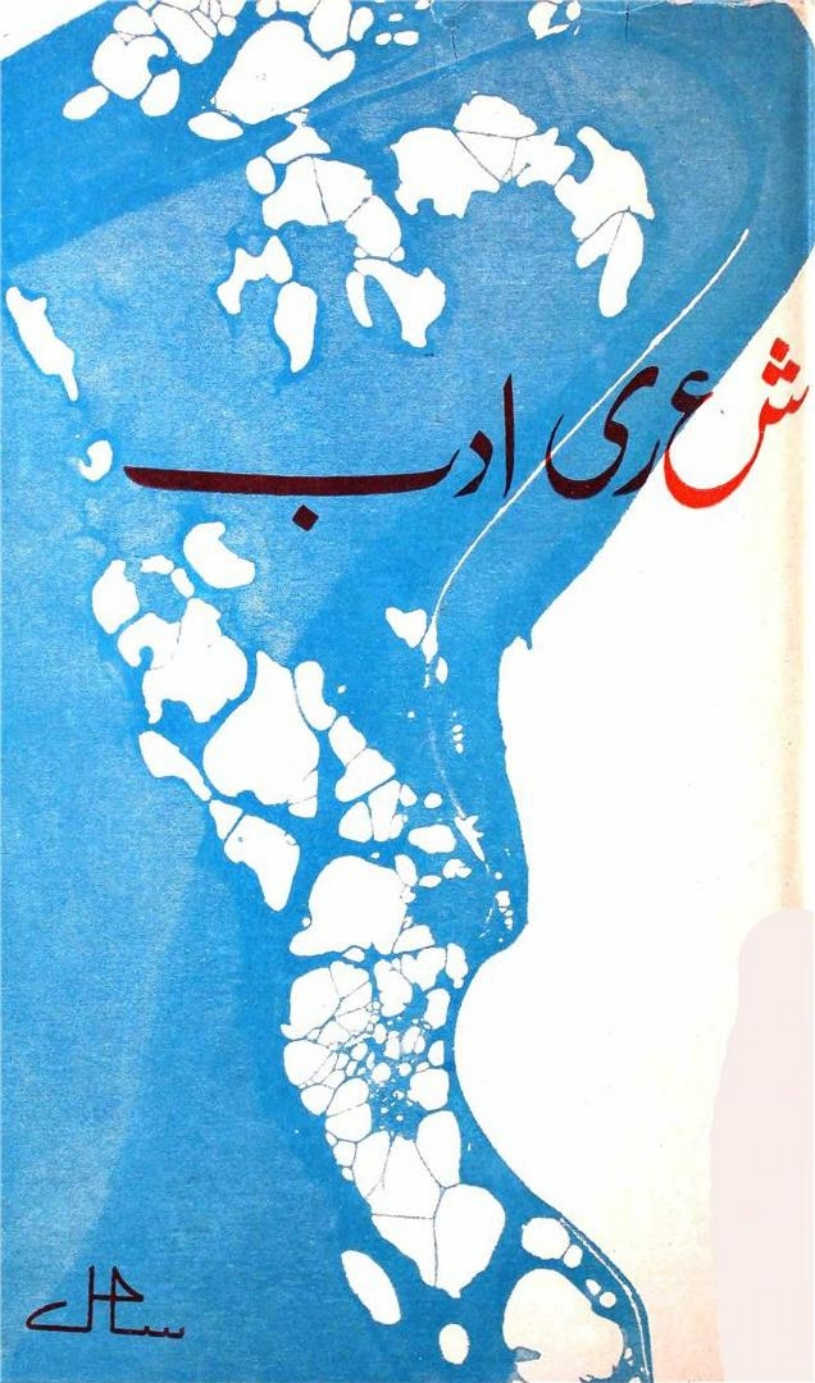

شعری ادب

ساحل

۱۹۷۷ کا شعری ادب

کرامت علی کرامت

جگن ناتھ آزاد

سلطان اختر

زیب غوری

ایک منظر

پردہ اٹھتا ہے
ایک پستہ قد شخص ناچنے لگتا ہے
جس کے سوکھے ہونٹوں سے چیخ کے سوا کچھ نہیں نکلتا
وہ بار بار جھکتا ہے
اپنے سائے ٹٹولتا ہے
اسٹیج پر بکھرے ہوئے سناٹے چن چن کر
اپنے کانوں میں بھر لیتا ہے
سب تالیاں پیٹنے لگتے ہیں
کچھ بھری پری سیٹیاں اس کے کاندھے جھنجھوڑنے لگتی ہیں
چند فقرے ہوا کی سان پر
اس کے ارد گرد منڈلانے لگتے ہیں
وہ دبی ہوئی چھاتیوں میں زور سے سانس بھرتا ہے
قہقہہ اچھالنے کی کوشش میں بلکنے لگتا ہے
اور پھر بلکتے بلکتے
زمین پر گر پڑتا ہے

عتیق اللہ

غزلیں

یوں مسلط تو دھواں جسم کے اندر تک ہے
دست رس آنکھ کی لیکن کسی منظر تک ہے
مڑ کے دیکھوں تو تعاقب میں وہی سایہ ہو
بھول جاؤں مرے ہم راہ کوئی گھر تک ہے
میں کہ ویران جزیرہ ہوں بسا دے مجھ کو
اے کہ اقلیم تری سات سمندر تک ہے
اس کے آگے مجھے بے سمت و نشاں جانا تھا
میں نے سمجھا تھا سفر آخری پتھر تک ہے

•

رات ہے اک تہی کشکول نظر کہتے ہیں
خواب کو ہم کھلی آنکھوں کا سفر کہتے ہیں
بے مکانی میں بھی خوش ہیں کہ اماں سے تو ہیں
دشت کو بے در و دیوار کا گھر کہتے ہیں
سنگ بے حس کو نہ یوں مار کے چل ٹھوکر سے
کہ دھمکتا ہے بہت بعد میں سر کہتے ہیں
کچھ نہ کچھ سائے میں ملتا ہے سبھوں اس کے تو
کھو کھلا ہو پہ اسے لوگ شجر کہتے ہیں

فرخ جعفری

اگست

مٹی کی صدا
ایک ذاتی اسطور
فاصلے سمٹ سمٹ گئے
گماں بہت
ایک رات

مٹی کی صدا

زمین آواز دیتی ہے
بدن میں روح اس آواز کو سن کر تڑپتی ہے
زمیں کی روح اپنے پیکرِ سنگ و سفالیں میں مچلتی ہے
بدن زنداں ہے اور دست و پا ہیں ہتکڑی، بیڑی
گلا ہے طوق اور انفاس سم آلودہ شمشیریں
قدم ہیں قید خانے کے ستوں اور خواہشیں لوہے کی زنجیریں
زمیں کی روح ہو، یا آدمی کی روح
قیدی یہ بھی ہے، وہ بھی
یہ قیدی مجلسِ تنہائی کے بے روزن و در، بے صدا، بے روشنی کمرے ہیں
عمریں ساتھ کٹتی ہیں
مگر اک دوسرے سے اجنبی ہیں
ادھر ہے جسم اندھا گونگا بہرا
ادھر بے چشم و گوش و لب بدن ہے

زمیں کی روح سے آواز آتی ہے
زمیں کے بطن میں پانی کے سوتے ڈھونڈنے والے
صدا سنتے ہیں پانی کی
چھٹی حس گونگے، بہرے اور اندھے جسم کی
سنتی ہیں آواز اپنی مٹی کی
میں ان روحوں سے واقف ہوں
وہ مجھ کو دیکھتی سنتی تھیں، مجھ سے بولتی تھیں
میں ان کو دیکھتا سنتا تھا، ان سے بولتا تھا۔

مگر بے روزن و در، بے صدا بے روشنی کمرے
کہاں کچھ دیکھتے، سنتے ہیں کہتے ہیں
یہ سننا دیکھنا کہنا ہے لاحاصل
مگر وہ، جو میرے اندر ہے سنتی دیکھتی تھی
مجھ سے کہتی تھی
کہ ہم زندانی رد حیں اپنی مٹی کی صدائیں سن رہی ہیں
وہ رد حیں اپنی مٹی کے لیے بے تاب ہیں کب سے
بدن نے سیکڑوں میلوں کی دیواریں کھڑی کی تھیں
بدن کو توڑنا آساں کہ بے تابی ہی کافی ہے
مگر دیوار ہائے فاصلہ سد سکندر ہیں
زمیں کے فاصلے ہوتے ہیں جسموں کے سفر سے طے
سفر کا شوق ہے آزاد، تہی جیبی کو اسباب سفر کیسے میسر ہوں
لیکن خود سفر زندانی قید معیشت ہے
بدن تو بے معیشت تھے
زمیں کو روح نے برسوں پکارا

مگر زر ہی بدن کو بال و پر دیتا ہے
زر آتا ہے کہاں سے
جہاں سے ریزۂ زر ہو مہیا
شکم کی آگ کھا لیتی ہے ہیڈم کی طرح اس کو
رو حیں بے زر و بے پر
بدن ہیں قید سد فاصلہ کے سامنے مجبور
مٹی کی صدائیں سن رہی تھیں
بدن تو پھر بھی ہے کم زر آخر ٹوٹ جاتا ہے

وہ روحیں فاصلوں سے ہار کر اپنے بدن سے ہی الجھتی تھیں
وہ آخر ایک دن قید بدن کو توڑ کر نکلیں
زمیں نے جب سے اب تک بیس سے زائد ہی پھیرے کر لئے ہوں گے مکمل اپنے سورج کے
وہ نامحسوس دیواریں کبھی کی گر چکی ہوں گی
جو مٹی کی صدا اور روح کے مابین حائل تھیں
وہ روحیں مٹی کے تودے
جن میں لوگوں نے جتن سے جسم کی لوٹی ہوئی زنجیر رکھ دی تھی
ہزاروں روز و شب کی گرد سے پامال ہو کر مٹ چکے ہیں
اسی مٹی سے پوچھیں
جو ہزاروں کوس سے آواز دیتی تھی
تری محبوب روحیں کیا تری آغوش میں آرام کرتی ہیں؟
ہیں قبریں بے نشاں تو روح کا کوئی نشاں ہوگا
کسی مٹی پہ چل کر فاتحہ پڑھ لیں
کہ مٹی کی صدا میں گم شدہ روحوں کی آوازیں بھی شامل ہیں
وہ آواز اب میرے صحرائے جسم و روح سے اٹھتی / مجھے آواز دیتی ہے
ہے روحوں اور صداؤں کے تعاقب سے تسلسل زندگی کا
صدا مٹی کی نغمہ میں ہے، سرگوشی بھی آہٹ بھی
نمود غنچہ و گل بھی، ہوا کی سرسراہٹ بھی
جو رکھوالے جاگتے ہی کو ہیں ان کی کسمساہٹ بھی
کسی مٹی پہ چل کر فاتحہ پڑھ لیں
ثواب اس فاتحہ کا زندگی ہی کو ملے گا
جہاں، جس رنگ، جس انداز میں ہو

وحید اختر

ایک ذاتی اسطور

زمین کر چکی طواف مہر مطلع وجود پر مرے ظہور مشتہر کے بعد
بارہ اور بارہ اور بارہ اور بارہ
تو سات فاختائیں میرے سامنے بہ یک بدن کھڑی ہیں ایک نام کے لباس میں
وہ نام جو حسین ہے، بلند ہے، عزیز ہے، لذیذ ہے
وہ سات فاختائیں جو کبھی غروب آفتاب کے جہان سے اڑا کے لائی تھیں
زیوس کے لیے شراب زندگی۔
وہ سات فاختائیں ہی تو ہیں
نوید نو بہار کے لجیلے زرد نقطے آسماں پر!
خزاں کی شور کرتی چیختی ہواؤں کے الجھے گیسوؤں کے جال میں
چھپی ہوائی کنواریاں وہی تو ہیں!
شکاری فلک ہے جن کے پیچھے آج بھی پڑا ہوا
سگ شکاری فلک مرے دل و جگر پہ بھی حریص آنکھیں گاڑ کر
مجھے ہراس میں کیے ہوئے ہے مبتلا
تو۔ اے کہ جس کے جسم میں وہ سات فاختائیں ایک اسم میں ہیں مجتمع
مرے وجود کے گھنے کنوارے جنگلوں میں آ
یہاں کسی سگ شکار کا گذر نہیں
کسی کا ڈر نہیں / مجھے وہ ہاتھ چاہییں
فصیل بن کے جو ہوائے تیز و تند سے مجھے بچا سکیں
مجھے ذرا سی روشنی
مرے وجود کے کنوارے جنگلوں میں آ

عمیق حنفی

فاصلے سمٹ سمٹ گئے

فاصلے سمٹ سمٹ گئے،
گھڑی کی سوئیاں
ڈائل پہ پھیلتی چلی گئیں
اور پھر
رگ و ریشہ میں اترتی چلی گئیں
اونٹ کے کوہان میں ریگ ریگ بس گئی
کیا تمام وقت شب کا تھا
سمندروں کی مچھلیاں بے آب ہو گئیں
تو پھر
گھڑی میں کیا بجا ہے اب
ستارے ٹمٹما چلے
عرش و فرش یوں چپک چپک گئے
کہ طاق میں رکھے ہوئے
روشن کتابوں کے ورق پھڑ پھڑا گئے
عالم لاہوت میں ناخن اور نرخرا
ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے
بے لباس لوگ تھے،
جسم جسم ہو گئے

اور پھر
وہ کہاں سے آئے تھے
نقطہ نقطہ ہو گئے
گھڑی میں کیا بجا ہے اب
عالم افلاک میں
دھند دھندرا کھ میں
ستارے یوں بکھر بکھر گئے
کہ زمین جسم پر
گندم کے دانے بکھر بکھر گئے
لامکاں ہو گئے
بے زباں ہو گئے
چور چور ہو گئے

گھڑی کا پنڈولم
پیہم جہد میں
خانہ بہ دوش ہو گیا
صدائے جرس بند ہے
ایک دھماکہ ہو گیا
تنشیب و فراز بھی
ریزہ ریزہ ہو گئے
گھڑی میں کیا بجا تھا جب
اور اب
فاصلے سمٹ سمٹ گئے

حمید سہروردی

گماں بہت

حرف یقیں دھواں دھواں تیرگیٔ گماں بہت
ڈوب چکا غبار رنگ رات تھی بے کراں بہت

ہم سے عبور کب ہوا دیدہ و دل کا فاصلہ
پیڑ کوئی ہرا نہ تھا، دھوپ تھی درمیاں بہت

شہر حواس کی فصیل تاب طلب نہ لا سکی
ڈھیر ہوئے مکاں کئی، جی کا ہوا زیاں بہت

موج نشاط کو بھلا دل کا سراغ کب ملا
اس کو بھی ہم سے بیر ہے، ہم بھی ہیں سرگراں بہت

پیاس، وہ کیسی پیاس تھی جس کی صدا پہ چل پڑے
ریت جدھر دکھائی دے، راکھ اڑی جہاں بہت

شمیم حنفی

ضیاء فتح آبادی

مظفر حنفی

آزاد گلاٹی

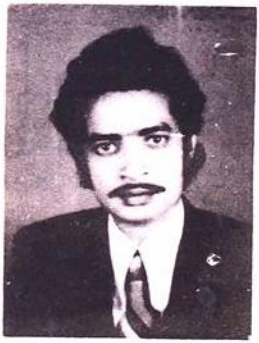

شام رضوی

ایک رات

اتنی پی جاؤ
کہ کمرہ کی سیہ خاموشی
اس سے پہلے کہ
کوئی بات کرے
تیز نوکیلے سوالات کرے
اتنی پی جاؤ کہ دیواروں کے بے رنگ نشاں
اس سے پہلے کہ
کوئی روپ بھریں
ماں، بہن بھائی کو تصویر کریں
ملک تقسیم کریں
یوں گرو ٹوٹ کے بستر پہ
اندھیرا کھو جائے
جب کھلے آنکھ سویرا ہو جائے

ندا فاضلی

ستمبر

کالے سفید پروں والا پرندہ اور میری ایک شام
سیمینار
اندر دیکھ
لقد جاءکم
تانترک نظم
ہوا کو نہ روکو
ڈر ہے یہ بھی
آبروئے شیوۂ اہل نظر
شب نامہ
ٹکاتا رہا
کنارہ کریں
سلسلہ کچھ اور
سوار کم نہ تھا
جمود
منظر تک آئے گی
دراب کے

کالے سفید پروں والا پرندہ اور میری ایک شام

جب دن ڈھل جاتا ہے سورج دھرتی کی اوٹ میں ہو جاتا ہے
اور بھڑوں کے چھتے جیسی بھن بھن' بازاروں کی گرمی، افراتفری
موٹر، بس، برقی ریلوں کا ہنگامہ تھم جاتا ہے
چائے خانوں' ناچ گھروں سے کمسن لڑکے، اپنے ہم سن معشوقوں کو۔
جن کی جنسی خواہش وقت سے پہلے جاگ اٹھی ہے
لے کر جا چکتے ہیں
بڑھتی پھیلتی اونچی ہمالہ جیسی تعمیروں پر خاموشی چھا جاتی ہے
تھیٹر' تفریح گاہوں میں تالے پڑ جاتے ہیں اور بہ ظاہر دنیا سو جاتی ہے

میں اپنے کمرے میں بیٹھا سوچا کرتا ہوں
کتوں کی دم ٹیڑھی کیوں ہوتی ہے
یہ چیت کبری دنیا جس کا کوئی بھی کردار نہیں ہے
کوئی فلسفہ کوئی' پائندہ اقدار نہیں' معیار نہیں ہے
اس پر اہلِ دانش، ودوان، فلسفی، موٹی موٹی ادق کتابیں کیوں لکھا کرتے ہیں؟
فرقت کی ماں نے شوہر کے مرنے پر کتنا کہرام مچایا تھا
لیکن عدت کے دن پورے ہونے سے اک ہفتہ پہلے، نیلم کے ماموں کے ساتھ بدایوں جا پہنچی تھی
بی بی کی صحنک، کونڈے، فاتحہ خوانی، جنگ صفین، جمل اور بدر کے قصوں،

سیرت نبوی، ترک دنیا اور مولوی صاحب کے حلوے مانڈے میں کیا رشتہ ہے؟

دن تو اڑ جاتے ہیں
یہ سب کالے پروالے بگلے ہیں، جو ہنستے کھیلتے لمحوں کو
اپنے پنکھوں میں موند کے آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں
راحت جیسے خواب ہے ایسے انسانوں کا
جن کی امیدوں کے دامن میں پیوند لگے ہیں
جامہ ایک طرف سیتے ہیں دوسری جانب پھٹ جاتا ہے
یہ دنیا لمحہ لمحہ جیتی ہے، مریم اب کپڑے سیتی ہے

آنکھوں کی بینائی ساتھ نہیں دیتی اب، اور غضنفر،
جو رومال میں لڈو باندھ کے اس کے گھر میں پھینکا کرتا تھا
اور اس کی آنکھوں کی توصیف میں غزلیں لکھوا کر لایا کرتا تھا
اس نے اور کہیں شادی کر لی ہے
اب اپنی لکڑی کی ٹال پہ بیٹھا ہے
اپنی کج رائی اور جوانی کے قصے دہرایا کرتا ہے
ٹال سے اٹھ کر جب گھر میں آتا ہے، بیٹی پر قدغن رکھتا ہے
نئے زمانے کی اولاد اب ویسی نہیں رہ گئی
بدکاری بڑھتی جاتی ہے
جو دن بیت گئے کتنے اچھے تھے

برگد کے نیچے بیٹھو یا سولی چڑھ جاؤ
بھینسے لڑنے سے باز نہیں آئیں گے

مدت سے ہم نے ایک تعاون کر رکھا ہے
سڑکوں پر سے ہر لمحہ اک میت جاتی ہے
پس منظر میں کیا ہوتا ہے نظر کہاں جاتی ہے
سامنے جو کچھ ہے رنگوں آوازوں چہروں کا میلا ہے

کرگل اڑ کر وہ پلکھن پر جا بیٹھی
پیپل میں توتے نے بچے دے رکھے ہیں
گل دم جو پکڑی تھی کل بے چاری مر گئی

نجمہ کے بیلے میں کتنی کلیاں آئی ہیں
پھولوں کی خوش بو سے کیا کیا یاد آتا ہے
یہ جب کا قصہ ہے سڑکوں پر نئی نئی بجلی آئی تھی، اور مجھے سینے میں دل ہونے کا احساس ہوا تھا

عید کے دن ہم نے لٹھے کی شلواریں سلوائی تھیں
اور سوئیوں کا زردہ ہم سائے میں بھجوایا تھا
سب نیچے بیٹھک میں بیٹھے تھے، میں اوپر کے کمرے میں بیٹھا
کھڑکی سے زینب کے گھر میں پھولوں کے گچھے پھینک رہا تھا
کل زینب کا گھر نیلام ہو رہا ہے
سرکاری تحویل میں تھا اک مدت سے!

شاید پت جھڑ کا موسم آ پہنچا
پتوں کے گرنے کی آواز مسلسل آتی ہے

چیچک کا ٹیکہ بیماری کو روکے رکھتا ہے
ضبطِ تولید، اسقاط وغیرہ
انسانی آبادی کو بڑھنے سے روکیں گے
بندر نے جب سے دو ٹانگوں پر چلنا سیکھا ہے
اس کے ذہن نے حرکت میں آنا سیکھا ہے
سڑکوں پر روز نئے چہرے ملتے ہیں
مدت سے ہم نے ایک تعاون کو رکھا ہے
پس منظر میں نظر کہاں جاتی ہے

پھولوں کی خوشبو سے کیا کیا یاد آتا ہے
چوک میں جس دن پھول پڑے سڑتے تھے
خونی دروازے پر شہزادوں کی پھانسی کا اعلان ہوا تھا
یہ دنیا لمحہ لمحہ جیتی ہے
دلی کی گلیاں ویسی ہی آباد شاد ہیں سب
دن تو کالے پروالے بگلے ہیں
جو سب لمحوں کو، اپنے پنکھوں میں موند کے آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں
چاروں جانب رنگ رنگ کے جھنڈے اڑتے ہیں
سب کی جیبوں میں انسانوں کے دکھ درد کا درماں، خوشیوں کا نسخہ بندھا پڑا ہے
لیکن ایسا کیوں ہے
جب نسخہ کھلتا ہے
۱۸۵۷ء آجاتا ہے
۱۹۴۷ء آجاتا ہے؟

اختر الایمان

سیمیتار

سکون دل کی آرزو
کے رنگ صد ہزار تھے
ہجوم حرف و گفتگو میں
ان کے نام : صرف ایک دو یا تین
لب پہ جب نہ آ سکے
تو چشم نارسا کی کیا بساط تھی
کبھی وہ پھیل کر جلی
کبھی سمٹ کے منجمد سی ہو گئی

طلوع سے غروب تک
تمام لوگ منتظر رہے کہ غیب کے سیاہ بطن سے

وہ حادثہ
وہ طفل نو

ہمکتا مسکراتا طفل نو
جنم ضرور لے گا
جس کے نور سے دمک اٹھیں گے بام و در
سکوں کے رنگ
ختم ہو گی، حرف و گفتگو کی جنگ
شام کی قریب آتی چاپ سے
کچھ اور تیز تر، شدید تر
زباں کی آتش و بیاں ہو گئی
گزرتی ساعتوں کے درمیاں
جلے ہوئے نشیمنوں کی خاک
لمس کے لئے اگرچہ نرم تھی
نہ جانے کیوں، نگاہ ماہتاب اتنی گرم تھی
فراز جام سے ابھی ابھی گری ہے شبنم سکوں
فراز جام سے ابھی ابھی اٹھی ہے
نرم رو، صدائے مشک بار، بادرنگ و بو
جو لوگ محو خواب ہیں
حصار خواب کی حدوں سے تھوڑی دیر میں ابھر کے آئیں گے
وہ نان آرزو، نئی سہانی اور گرم دھوپ سے پکائیں گے
بدلتے موسموں کے ساتھ بار بار
حرف و گفتگو کی بزم سرگراں سجائیں گے

اندر دیکھ

ادھر آ اور ان خیموں کے اندر دیکھ
وہ سوئے ہیں سکوں فردوس بستر دیکھ
انہی کے لب پہ شب کی حمد اول تھی
انہی کے بخت میں خوابوں کے دفتر دیکھ
عجب الجھی ہوئی آندھی چلی شب بھر
یہاں ٹوٹا نہیں کس شے کا محور دیکھ
فصیل شہر کے پتھر خلا میں تھے
مگر قائم رہی خیمے کی چادر دیکھ
اندھیرا اور اندھیرے میں بپا محشر
مگر ان کے سکوں کو رد محشر دیکھ
حصار حمد کے اندر پڑے سوئے
صفا و صدق کے بیٹوں کے تشکر دیکھ
ہلاکت خیزیوں کے درمیاں باقی
ابھرتی صبح کا محفوظ منظر دیکھ

لقد جاءکم

جس نے تیری کمر کا ٹیڑھا بوجھ
سایۂ برگ میں بدل ڈالا
جس نے اس کو بنا دیا خوش بو
وا ہوا زر نگار دروازہ
وسوسے خوف کے کچوکے، رنج
وسعت خانۂ خلائے علم
اس میں نورِ یقیں کی تنہائی
کائنات اجنبی اتھاہ شدید
اس میں نازک یہ گل کھلے نہ کھلے
جس نے تجھ کو نہان تاریکی
کربِ تنہا و بے اثر مجبور
سے بچایا، کلام تجھ سے کیا
جب اڑی یاد مہر کی خوش بو
سینۂ زرم چاک و پاک ہوا
جس نے افلاک قوت و نخوت

پرکاش فکری

عصمت جاوید

عنوان چشتی

وہاب دانش

کے سفیروں کو آستاں پہ ترے
سرو قد عصمت و صفائے دل
سے مزین سجود میں رکھا
جس نے تیرے لئے ترا ہی ذکر
مثل موج ہوا بلند کیا
تو وہ در یتیم تھا جس کو
اس نے پہلو میں اپنے وارد یا
تو وہ گل تھا جو کشت غربت میں
نو دمیدہ تھا اور اس نے تجھے
ہر دو عالم تو نگری بخشی
تو وہ ابن السبیل تھا جس کو
اس نے ہر شاہراہ ارض و فلک
کی مسافت کا بادشاہ کیا
تو وہ شب زندہ دار تھا جس کو
اپنی لاحد و لازوال نگہ
کے اشارے سے، صبح گہہ کے قریب
بے نہایت افق کے کوے پہ
اس نے اک نجم شوخ دکھلایا
جس نے پیشانی منور اور
چشم شاہین رکھنے والے کئی
تجھ کو افواج جاں نثار دیئے
وہ ترا رب تھا، دوست تھا، کیا تھا

شمس الرحمٰن فاروقی

تانتوک نظم

۱۔ دیوی پوجا دھرم ہے میرا
ننگی عورت شکتی ماں ہے
ماں مجھ کو آغوش میں لے لے
اور شرن دے پستانوں میں
میں اک گہری سوچ میں گم ہوں
میری دیوی، میرا من تیری رانوں میں
روپ ہے دھوپ "مدن مندر" کی
تیز ہے میرے دھیان کا دھارا
ہم سب پرانی یونی پوجا کے ارمانی
یونی اور لنگم کا ملن سنسار ہمارا
بھوگ ہمارا، یوگ کا سادھن
سب سے میٹھا رس ہے ملن کا
مانو کا نرمان ملن ہے

۲۔ مرد پجاری اپنے آپ کو عورت سمجھے اور اپنی تکمیل کے خاطر
عورت کے سے کپڑے پہنے، ویسے چلے اور ویسے بولے، ویسے ڈڈرے
ایسا مرد جو ہو طبعین بھی عورت جیسا پاکیزہ ہے
"اردھ مرد" ہے شخص مقدس، اس سے بھوگ نیا انوبھو ہے
روحانی آنند کا سادھن، انسانی کلیان کا درپن

۳۔ دھرم ہے میتھن

میتھن کے ہیں کتنے آسن
شرط یہاں بھی من کی لگن ہے
عہد گمن میں، سب، میتھن کا دم بھرتے تھے
اور بچاری مندر میں بھی میتھن دھرم کا پالن روز و شب کرتے تھے
بھوگ کی بھگتی جادو شکتی

۴ ریڑھ کی ہڈی کے نیچے سوئی ہے کنڈلی مارے سانپن
یہ بھی ہے سدھی کا سادھن
لیکن اس سے چوکس رہنا
اس کو بھگانا یوگ کے بس میں
آہستہ آہستہ جاگے، آپ گرم سی چڑھتی جائے....
چڑھتی جائے سر کی جانب
ہر منزل پر اس کی شکتی، گرمی اور پسینہ بانٹے، چھتے کانٹے
یہ مانو پر قابو پائے تو مانو مرتیو کے حوالے
اس پر مانو قابو پائے تو سارا سنسار سنبھالے

۵ مے نوشی اور گوشت خوری سے بھی روحانی لذت پانے والے یوگی
مایا روگی، سوگی، بھوگی، میری مکتی کیوں کر ہوگی
دہلی کے بھیرو مندر میں، آج بھی لوگ چڑھائیں مانس اور دارو
جان لیوا ہے بھوگ کی "خوش بو"
کتنی گھاتیں، کتنے چکر، کتنے ہی بیکار عقیدے
جن سے کھیلا، جن سے بہلا انساں کا دل، کتنے ہی اوہام باطل
ننگی عورت شکتی ماں ہے
ماں مجھ کو آغوش میں لے لے اور شرن دے پتانوں میں

ہوا کو نہ روکو

ہوا طے شدہ راستوں کی مسافر نہیں ہے
ہوا کا سفر بے نشاں منزلوں کی طرف بھی رہا ہے
مگر سچ تو یہ ہے اس آزاد رو نے جدھر رخ کیا ہے
نئے راستے خود بہ خود بن گئے ہیں
نئی منزلیں سامنے آگئی ہیں

شرارت پہ آمادہ آوارہ جھونکے
کبھی دیو قامت پہاڑوں، تناور درختوں کو بے طرح چھیڑیں
کبھی خوش نما گھاٹیوں، پرسکوں وادیوں میں اتر کر۔
پریشان کن کھیل کھیلیں
کبھی دشت و دریا میں ہل چل مچائیں
کبھی چاند سورج کی شمعیں جلائیں
ہزاروں برس اس پرانی زمیں کے مکینوں کو کیا کیا انوکھے تماشے دکھائیں

مگر سچ تو یہ ہے، یہ آوارہ جھونکے
ہماری گنہ گار آبادیوں سے اگر روٹھ جائیں
نئے موسموں کے مقدس فرشتے
ہمیں موت کی بے حسی سے بچانے۔
ہمارے عفونت زدہ مقبروں میں نہ آئیں
ہوا چلتے چلتے رک گئی تھی تو کتنی گھٹن تھی
یہاں سے وہاں تک۔
ہر اک زندہ شے کس قدر خستہ جاں خستہ تن تھی
کچھ آوارہ جھونکے مگر سرسرائے
درختوں پہ چپ چاپ بیٹھے پرندوں نے پر پھڑپھڑائے
ہوا چل پڑی ہے تو کتنی سہانی فضا ہے
یہاں سے وہاں تک۔
ہر اک زندہ شے جیسے نغمہ سرا ہے
یہ نغمہ کہ جو زندگی کے محافظ فرشتوں کی آواز پا ہے

ہوا چل پڑی ہے تو اس کو نہ روکو
ہزاروں برس اس پرانی زمیں کی گواہی کو مانو
اس آزاد رو نے جدھر رخ کیا ہے
نئے راستے خود بہ خود بن گئے ہیں
نئی منزلیں، یعنی تازہ سفر کی شروعات کے مرحلے سامنے آگئے ہیں
جو مردہ مناظر تھے دھندلا گئے ہیں
ہوا کو نہ روکو۔

محمود سعیدی

ڈر ہے یہ بھی

ہے بہت طاق وہ میدان میں ڈر ہے یہ بھی
جاں سلامت نہ بچا لاؤں خطر ہے یہ بھی

دل کی لو پھر اسی ٹھہراؤ پہ آجائے گی
اک ذرا دیر ہواؤں کا اثر ہے یہ بھی

جوئے پایاب محبت میں جواہر مت ڈھونڈ
کسی پتھر کو سمجھ لے کہ گہر ہے یہ بھی

منزلیں ختم ہوئیں ترک و تعلق کی تمام
اب کسی سمت نکل جا کہ سفر ہے یہ بھی

کف سیلاب میں ہے نقش تمنا باقی
کچھ لہو دل کا بچالے کہ ہنر ہے یہ بھی

دشت و در میں وہی سرخی وہی پیڑوں میں چمک
زرد پھولوں کو نہ دیکھو تو سحر ہے یہ بھی

آگے چل کے تو کڑے کوس ہیں تنہائی کے
اور کچھ دور تلک لطف سفر ہے یہ بھی

کیا ہے میں جس کے تجسس میں ہوں سرگرداں بھی
زیب کچھ ہاتھ نہ آئے گا خبر ہے یہ بھی

زیب غوری

آبروئے شیوۂ اہل نظر

ہوائیں سمندر کو لوٹیں
تو بولیں
سڑک پر وہاں کوئی ایسا شجر ہی نہیں ہے
کہ ہو جس کی شاخوں میں نرمی صبا کی
کہ ہوں جس کے پتے ابھرتے نئے دن کی زرکار کرنوں سے روشن
پرندوں نے جس پر نہ ڈالا ہو ڈیرا
نہ لپٹی ہوں بیلیں ہی شاخوں سے جس کی
تنا بھی تنا ہو
ہوائیں سمندر کو لوٹیں، تو بولیں
وہاں ایک آنگن میں اک پیڑ ہے
جس کی شاخیں سیاہ
جس کے پتوں کے ریشے بڑھاپے کی روشن لکیریں ہوئے ہیں
بسیرا ہے اس پر کئی طائروں کا
کئی گھر لٹے ہیں
کئی اڑ گئے ہیں
کئی ایک بیلیں بھی لپٹی ہوئی ہیں
تنا ہے خمیدہ
ہوائیں سمندر کو لوٹیں، تو بولیں
شجر ہے
کہ تم جس کی شاخوں سے لپٹی ہوئی ہو

شب نامہ

یہ ابر پاروں، ستاروں کا سائباں دھندلا
سراغ رحمت کامل پہ اونگھتا پہرا
نظر وراں! یہ بتاؤ نظر سے کیا پایا
کرن سی یہ کہ جو کرتی ہے آر پار نفوذ
سکوت فاصلہ، بے کنار توڑے بغیر،
خلا نورد ہم آہنگیوں کا الجھاوا
ہنر جو اس کو بنایا ہنر سے کیا پایا

وہی تحیر بے مدعا، وہی دوری
پکارتی ہوئی پیہم قبولیت کی گھڑی
جو مل گئی بھی تو کچھ مانگنے کا پیرایہ
کہاں سے لاتے اسی دن کو دھیان میں رکھ کر
ریاض دمشق سے کچھ مانگنے کی عادت کو

جو بارہ بارہ برس پختہ کرتے رہتے تھے
ہمارے پرکھے ، وہ بھکشو غضب کے دانا تھے

تو پھر چلو کہ نظر اور نظاروں کے مابین
حجاب جتنے بھی ہیں شان بے نیازی کے
انہیں اٹھاتے ہوئے جان کی اماں مانگیں،

تو پھر چلو کہ ابھی وقت ہے، اندھیرا ہے
نشیمنوں میں شکر خوابیوں کے عالم کو
صدا لگاتے ہوئے دیکھتے دکھاتے چلیں
ملے در دل درد آشنا تو دستک دیں
وگرنہ فاصلہ رکھ کر سوال دہرائیں

بلند بام سماعت سوال سننے سے
نہ سیر ہو ، نہ پسیجے ، نہ اشتعال میں آئے
یہ تاڑ بن ، یہ بلندی کا ٹیڑھا میڑھا طلسم
یہ جھنڈ جھنڈ تنے اپنی چھتریاں تانے
خود اپنے اوج زبوں کے خطوط کج مج پر،
کبھی قبیلہ کے خم ، تاستے حلیفوں نے
خفیف چھاؤں طلب کی تو بے دریغ ملی
نصیب غیر نہ کچھ تاڑنا نہ کچھ پانا
ہر ایک گھونٹ جو ہو کر کراکشیدہ بہ ریگ

لہ دکنی لفظ۔ درختوں سے رس کشید کرنا

نصیب غیر ہو یارب، نصیب خویش مزے

نئی نئی کسی افتاد جیسا یہ منظر ــــ،
کھپا کے رکھ دے جو نسلوں کے بعد نسلوں کو
بہت دنوں سے یہ جاری عجیب صورت حال
سرشت کہنہ کا، اپنی ہی منتہا تو نہیں
سوال اک ان سے جو اونچا سنیں، ضرور کریں
جواب بھی بہ اشارات رائگاں مانگیں

ہوا کے شور سے بیدار ہو کے دل کی الاپ
ہوا کے شور میں پھر گم سی ناشنیدہ سی
چٹانوں تک بھی پہنچی تو بازگشت کی گونج
کبھی تو ملتی ــــ انھیں منقطع وسیلوں میں
کوئی ہنکارا، کوئی عکس منتشر سر موج
کسی بھی موڑ پہ درماندہ کھوج کی خاطر
گرا پڑا کوئی موتی شکستہ مالا کا
ملے ملے نہ ملے پھر بھی ڈھونڈنا ہے ضرور

اکیلے پن کی بکھرتی ہوئی نمود جسے
ملا ہے گہرے سمندر کا خود کلام نشہ
جواز اس کے لئے ساحل تمنا کا
شناخت کے لئے اپنی کوئی نشاں مانگیں

شفیق فاطمہ شعریٰ

مظہر امام

بشر نواز

راج نرائن راز

عادل منصوری

لگاتا رہا

سمجھ کے اپنا جسے سینے سے لگاتا رہا
پرایا تھا، مرے زخموں پہ مسکراتا رہا
ہوئی سحر تو کہاں کھو گیا اجالے میں
جو رات بھر مرا دروازہ کھٹکھٹاتا رہا
حصار جسم سے باہر نکل تو آتا مگر
مرا ہی سایہ مجھے رات بھر ڈراتا رہا
وہ ہار کر بھی نہ ہارا، عجب تماشا ہے
میں جیت کر بھی زمانے سے مات کھاتا رہا
بہت ملال تھا تنہا روی کا اپنی ضیا
کسی کے ساتھ چلا بھی تو ڈگمگاتا رہا

ضیاء فتح آبادی

کنارہ کریں

ہوا ہے زہر سمندر لہو کنارہ کریں
سراب دست صدف چشم استعارہ کریں
گہر جزیرہ سہی موج موج اژدر ہے
بنائیں ریت کے گھر مچھلی پر گزارہ کریں
قدم اٹھاتے ہیں عفریت گاہ کی جانب
زباں سے کہہ نہ سکیں آنکھ سے اشارہ کریں
رہا نہیں ہے کوئی نیک کام کرنے کو
فلک فضا سے ستاروں کو ہی انارا کریں
ہے ایک ہلکے سے جھونکے کا انتظار اسے
یہ کیسے بجھتا ہے اب دور سے نظارہ کریں
اک ایک شخص کو ہے انتظار بینائی
حروف پوش ہیں اسرار آشکارہ کریں

حامدی کشمیری

سلسلہ کچھ اور

بڑھا پھر اس کی توجہ کا سلسلہ کچھ اور
خوشی سے پھیل گیا غم کا دائرہ کچھ اور
میں اپنے آپ کو کس آئینے میں پہچانوں
کہ ایک عکس مرا کچھ ہے دوسرا کچھ اور
اگر کہیں کوئی دیوار سامنے آئی
بلند ہوگیا پانی کا حوصلہ کچھ اور
مرے رفیق مرے غم گسار ہیں لیکن
کبھی ٹھکانا مرا کچھ کبھی پتہ کچھ اور
گذر محال نہ ہوتا کسی کا بستی میں
جو اٹھتیں چھوڑ کے دیواریں راستہ کچھ اور

غلام مرتضیٰ راہی

سوار کم نہ تھا

پیادہ ہو کے بھی کسی سے وہ سوار کم نہ تھا
اسے بھی اپنے اس گماں پہ اعتبار کم نہ تھا
کرن کرن تھی تشنہ، قطرہ قطرہ آبِ جنت تھا
یہ دیکھ کر خود آفتاب بے قرار کم نہ تھا
ہوا کا دست بے قلم یہ کیا فسانہ لکھ گیا
صدا کے سر پہ بے صدائیوں کا بار کم نہ تھا
نقاست خیال کا طلسم اس پہ چھا گیا
وگرنہ اس کو ٹوٹے آئینوں سے پیار کم نہ تھا
یہ اور بات وہ لغت میں گھس کے مجھ پہ ہنس پڑا
مجھے بھی اپنے لفظ پہ کچھ اعتبار کم نہ تھا
نہ صرف یہ کہ راستے ہی بے یقیں لکیر تھے
مری نظر میں بھی شکوک کا غبار کم نہ تھا
وہ اپنے سر پہ تہمتیں اٹھا کے چل دیا مگر
ہوا کے بولنے کا اس کو انتظار کم نہ تھا
مرے ہی ہاتھ اک سپر تھی عکس سایہ کی بنی
وگرنہ کاٹ میں تمہارا کوئی وار کم نہ تھا
وہ کس طرح کے لوگ تھے جنہیں خبر نہ ہو سکی
حصارِ جسم سے نگاہ کا حصار کم نہ تھا

حکیم منظور

جمور

کہاں وہ دوڑتی سڑکیں
لپکتے گھر / ابلتے لوگ
بڑھتا شور، اڑتا آسماں
کہاں یہ چار دیواری کے اندر کا سماں، جس میں
اٹھاؤں تو اٹھے ماچس،
جلاؤں تو جلے سگرٹ
کتابوں کو اگر چھیڑوں تو غوں غاں کرنے لگتی ہیں
نہیں تو جس جگہ اوندھی پڑی تھیں، بس پڑی ہیں
نہیں کرسی میں اتنی بھی سکت کہ پاس آئے
کہ ٹانگیں اس کی پتھر میں گڑی ہیں
قلم کو اک جگہ رکھ دو تو صدیوں کیا؟ ابد تک بس وہیں لیٹا رہے گا
ادھورے خط کو بھی اتنی نہیں توفیق کہ خود ہی مکمل ہو کے یاروں سے ملے
میں خود ٹانگیں چلا کر اپنے دسترخوان پر جاؤں
نوالے اپنے ہاتھوں سے بنانے کی کروں کوشش تو بنتے ہیں
گلے سے جب اتاروں تو اترتے ہیں
میں اپنے ان اپاہج ساتھیوں کے ہاتھ سے تنگ آگیا ہوں

عصمت جاوید

منظر تک آئے گی

دل سے چلے گی، آنکھوں کے منظر تک آئے گی
زخموں کی اک برات "گل تر" تک آئے گی

ہونٹوں پہ کب کے سوکھ گئے "برگ تشنگی"
کیا اب یہ "آگ" دل کے سمندر تک آئے گی

بیٹھی تو ہے "سفید پروں" کو سمیٹ کر
کیا "دھوپ" اب اتر کے مرے گھر تک آئے گی

اتنا تو خیر ربط ہے اب بھی کہ اس کی یاد
شانے پہ ہاتھ رکھ کے مرے گھر تک آئے گی

یہ پوچھتی ہیں اب مری آنکھیں جلی ہوئی
کیا اب یہ برق خوابوں کے پیکر تک آئے گی

عنوان چشتی

دراب کے

کھلے رہیں گے مکانوں کے سارے دراب کے
کوئی نہ لوٹ کے جائے گا اپنے گھر اب کے

گلی میں گھومتے پھرتے ہیں چونکتے سائے
رہ حیات ہوئی کتنی پر خطر اب کے

حسین رت ہے مگر کون گھر سے نکلے گا
ہر اک بدن میں سمایا ہوا ہے ڈر اب کے

قدم قدم پہ گھٹنے، پیڑ، چھاؤں کی خاطر
کچھ اور سخت ہوا درد کا سفر اب کے

دھواں اگلتی ہوئی رات کہہ رہی ہے شمیم
کسی مکاں کو نہ چھوڑے گا یہ شرر اب کے

شمیم فاروقی

THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM

LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.

خیال تراش

آگہی کا نیا خیال تراش
شعر میں نقطۂ جمال تراش
بات لفظوں میں پھیل جائے تو پھر
صفحۂ فکر خدوخال تراش
تیشۂ فکر کو لہو سے رنگ
ایک تصویر بے مثال تراش
ہاتھ میں تیشۂ حیات لے
زخم ہستی کا اندمال تراش
چشمۂ آب پر سکندر کی
ایک تصویر پائمال تراش
منجمد ہو گئی ہیں تصویریں
شہر ساکت میں اشتعال تراش
راہ مسدود تو نہیں ساحل
آسماں پر رہ خیال تراش

ساحل احمد

اکتوبر

ملبوس ہے یا گل
سہلائیں گی
رات کی آنکھ میں خنجر اگا
نگراں میں ہوں کہ تو،

عبداللہ کمال

کرشن موھن

حمید سہروردی

شفیق فاطمہ شعری

ملبوس ہے پاگل

میلے کچیلے کپڑوں میں ملبوس ہے پاگل
اس کی نظر میں امریکہ ہے روس ہے پاگل

یہ تو اک دریوزہ گر دیوانہ نکلا
ہم تو یہ سمجھے تھے اک جاسوس ہے پاگل

روگ ہے یہ مایا جس کا پریوگ نہیں ہے
اتنی پونجی رکھتے بھی، کنجوس ہے پاگل

مسرف بیٹوں کے کام آئے گی یہ دولت
سیٹھ بہت کنجوس ہے، مکھی چوس ہے پاگل

راہ گزر میں جب بھی وہ مجھ سے ملتا ہے
ہنس دیتا ہے، مجھ سے بہت مانوس ہے پاگل

اپنے انت سے غافل ہے دھندے کا بندہ
عقل و ہوش کے پھندے میں محبوس ہے پاگل

عالم کل تو جانتا ہے واعظ کی حقیقت
پہنے ہوئے کیوں پیرہن سالوس ہے پاگل

خود کو نوچ بھی لیتا ہے، رو بھی دیتا ہے
اپنے آپ کا بھوت ہے، اک کابوس ہے پاگل

کایا کی یہ جوت ہی مانو کی مایا ہے
سمجھے یہ مٹی کا دیا، فانوس ہے پاگل

کرشن موہن

سہلائیں گی

بند دروازوں کو جب جب دستکیں سہلائیں گی
بھولی بسری ساری باتیں دیر تک یاد آئیں گی
ناؤ کاغذ کی بنانے میں ہیں بچے منہمک
پانیوں سے یہ ڈھکی سڑکیں کہاں تک جائیں گی
کون ان کے واسطے روشن کرے گا راستے
دور ہو کے ہم سے پھر پرچھائیاں پچھتائیں گی
ناچتی آوارہ پھرتی تتلیوں کو کیا خبر
ایک دن آئے گا ایسا کونپلیں مرجھائیں گی
بے درختوں کی زمیں تک ہے سفر کا سلسلہ
دیکھنا ہے اور آنکھیں ہم کو کیا دکھلائیں گی
عکس اک ٹھہرا ہوا ہے کب سے سطح آب پر
تیز طوفانی ہوائیں کب ادھر کو آئیں گی

شہریار

رات کی آنکھ میں ایک خنجر اگا

رات کی آنکھ میں ایک خنجر اگا
رات کالی ہے، اجلی ہے، پیلی ہے، نیلی ہے یا پھر
رات کا کوئی رنگ ہی نہیں ہے
مگر جو بھی ہو، رات کالی ہے..... ایسا سمجھ لیجیے
رات کالی ہے، بہتی ہے جیسے ندی، اندھے پانی کی، کہرے کی یا دھند کی

رات کی آنکھ میں اک خنجر اگا
ایک وحشی پرندے نے خنجر کا بوسہ لیا
نوک خنجر..... پرندے کی آنکھوں میں سازش کا نشہ مچا
خواب کی دھند، اندھی ندی، زرد شعلہ بنی اور بہتی رہی
پھر کہیں زرد رنگوں کے پتھر کی بارش پرائے شہر میں روانہ ہوئی
راحتوں کے مکاں کے منڈیروں سے راحت کے کوے اُٹھے
شور کی کنکری سے، کنویں بھی بھرے، آئینہ آئینہ سی فضا بھی جلی
ایک قصے کی انٹی پرانی نئی، پھر کہیں بوم کا آشیانہ بنی
رات کی آنکھ میں ایک خنجر اگا

اختر یوسف

نگراں میں ہوں کہ تو

پس در آنکھ ہے کوئی نگراں ، میں ہوں کہ تو
لمحہ بھر کو ندا جو اک شعلۂ جاں ، میں ہوں کہ تو
دشت بے چہرگی ہے تیرا کہ میرا مقسوم
لا صدائی کا اب اک ریگ رواں میں ہوں کہ تو
ثبت احساس پہ اب کس کے ہے یہ عالم ننگ
شامل قافلہ گرد سفراں ، میں ہوں کہ تو
قطرۂ لذت سرشاری دل ، تو ہے کہ میں
واقف زہر کف خاک جہاں ، میں ہوں کہ تو
انگلیاں کس کی ہیں اب خیمۂ گل ، مجھ سے پوچھ
سر فراز بدن لالہ رخاں ، میں ہوں کہ تو
جسم زرخیز ہوا کس کا بھلا ریزۂ خاک
درد کی فصل کا اب مرتبہ داں ، میں ہوں کہ تو
جست پیوست ہے اب کس کا لہو مجھ میں طور
آج منجملۂ آتش نفساں ، میں ہوں کہ تو

کرشن کمار طور

نومبر

اکتساب سے تھا
دھارے کی
سمندر کے سینے کے خاموش اسرار
لکھی ہوئی ہے بستی

اکتساب سے تھا

مجھے ذرا نہ شغف اخذ و اکتساب سے تھا
مرا معاملہ خود اپنے انتخاب سے تھا

کل اس نے مجھ پہ اچھالے جو برمحل فقرے
وہ اقتباس بھی خود میری ہی کتاب سے تھا

مری زباں جو نہ کھلتی تجھے سمجھتا کون
تو وہ سوال جو واضح مرے جواب سے تھا

بہ رنگ یک قدح زہر تھا وجود اپنا
ہماری پیاس کو کب واسطہ شراب سے تھا

ہر ایک سانس پہ کھلتا رہا گرہ کی طرح
بندھا ہوا یہ مرا جسم کس طناب سے تھا

نہ برسے سنگ ملامت تو زخم سوکھ چلیں
میں باغ باغ ترے حرف ناصواب سے تھا

سفر مدام سفر اور بے جہت کا سفر
لگا ہوا کوئی چکر مری رکاب سے تھا

کوئی اٹھا بھی جوے جائے کچھ پتہ نہ چلے
میں وہ ورق، جو نکالا ہوا کتاب سے تھا

وہ شخص کیا مری افسردگی کو بہلاتا
کہ گرد گرد وہ خود بھی اسی حباب سے تھا

فضا وہی تھا چٹانیں ترا شنے والا
لہو لہو جو گل و لالہ کے عذاب سے تھا

فضا ابن فیضی

دھارے کی

جھکے ہوئے پیڑوں کے تنوں پر چھاپ ہے چنچل دھارے کی
ہولے ہولے ڈول رہی ہے گھاس ندی کے کنارے کی
کسی ہوئی مردنگ سا پانی ہوا کی تھاپ سے بجتا ہے
لہر ترنگ سے اٹھتی ہے جھنکار کسی اکتارے کی
کھلی فضا میں نکلے تو رنگ یک سانی دور ہوا
ایک ہوا کے جھونکے نے رنگت بدلی انگارے کی
دیکھ رہا ہوں بند خدا کی مٹھی ہونے والی ہے
صبح کے موتی پر اب بھی ہے دھیمی آنچ ستارے کی
سخت چٹانیں ، شیشہ پانی ، گل بوٹے سب ضائع تھے
سنگ و شجر کو معنی دے گئی تان کسی بنجارے کی
ہجر کی نیرنگی کے منظر ، پس منظر کیا کیا دیکھوں
کتنی سہانی رات پڑی ہے اور فرحت ہے شرارے کی
باسی پھول کی پتی پتی بکھری ہاتھ لگاتے ہی
دل کی اداسی کو چھیڑا تو خاک اڑی بے چارے کی
ہم بھی پہاڑوں کو دیکھیں گے اڑتا روئی کے گالوں سا
بوجھ زمیں کچھ اور اٹھالے ، ہے بس زیر اشارے کی
سرمایہ لا حاصل کا ہے زیب اپنا فن ، اپنا ہنر
ہم نے تجارت جان کے کی ہے سچ پوچھو تو خسارے کی

زیب غوری

سمندر کے سینے کے خاموش اسرار

نہ ہم تم، نہ وہ لفظ و معنی کے بے باک رشتے
نہ اپنی حدوں سے گزرتے ہوئے تند احساس کا، رقصِ رنگیں
نہ جلتے بدن کانپتی روح کا، سیلِ آتش
نہ جسموں کے آہنگ میں غرق ہوتی ہوئی، روحِ ہستی
نہ اظہار کی جوئے بے روک، کاغذ پہ جلتے ہوئے سرخ دھبے
نہ انکار و اقرار، رفتار و حرکت، نہ امکانِ تازہ کی بے ساختہ مسکراہٹ
کہ ہم تم، نہ وہ لفظ و معنی کے بے باک رشتے
بہت فاصلے پر، جہاں درد کا آسماں جھک گیا تھا
وہیں ٹوٹے بکھرے ہوئے سنگ ریزوں پر، کچھ نقشِ پا مرتسم ہیں
کوئی نقش بر سنگ، کب نقش بر آب کی طرح مٹتا ہے
ہستی کے اوراق پر، خامۂ آرزو چل پڑے گر تو رکتا نہیں،
کسی ابر کے نرم آوارہ ٹکڑوں سے کہہ دو، کہ برسے، گھٹا ٹوپ اندھیروں میں برسے
انہیں پتھروں پر، اسی نقش بر سنگ پر...... بے محابا
کہ جلتی ہوئی ریگ، ہر قطرۂ ابر کے وصل کا منتظر ہے
کہ ہم تم بھی، انکار و اصرار کی سرحدوں سے پرے، جستجوئے مکافات ہیں
اک نوائے دگر قلبِ امکاں میں ہے
ایک حرفِ دیگر اپنے دن رات ہیں
کہ رفتار و حرکت سمندر کے سینے کے خاموش اسرار ہیں
کہ ہم تم دریں پردۂ سازِ ساکت
ہر اک لمحہ شکلیں بدلتی ہوئی، خوئے افراد ہیں

ساجدہ زیدی

لکھی ہوئی ہے بستی

ہاتھوں میں لکھی ہوئی ہے بستی
ہونٹوں کی پڑھی ہوئی ہے بستی
پلکوں میں چھپا ہوا ہے آنسو
آنکھوں میں سجی ہوئی ہے بستی
سورج سے جڑی ہوئی ہیں کرنیں
کرنوں کی جلی ہوئی ہے بستی
آنگن میں کھلے ہیں پھول رنگیں
رنگوں میں بٹی ہوئی ہے بستی
اخبار پہ انگلیاں جمی ہیں
لفظوں میں چھپی ہوئی ہے بستی

ساحل احمد

دسمبر

پھر یاد آئے
اترے گا
کتبے
سہانے آئے ہیں
خواب ہوا ہے
رکھے نہیں ہیں
پک رہی ہوگی
مگر رہ جائے گا
انتشار کتنا
بچھا بھی دے

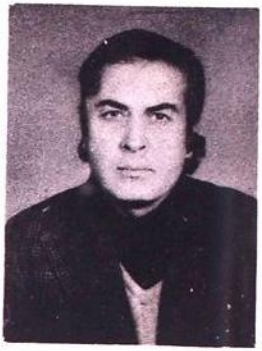

زبیر رضوی

ندا فاضلی

حکیم منظور

محمد علوی

پھر یاد آئے

پھر دشت و فا لو دینے لگا بھولے ہوئے غم پھر یاد آئے
جو ریگِ رواں میں ڈوب گئے وہ سارے مسافر یاد آئے

کچھ رنگ تھے ہلکے گہرے سے پرچھائیاں تھیں یا چہرے تھے
وہ لوگ نہ جانے اب ہیں کہاں جو تیری خاطر یاد آئے

سناٹے کے نوحے سنتا ہوں خاموشی کے ہالے بنتا ہوں
دیوانوں کی جب بھی یاد آئی ویرانے بہ ظاہر یاد آئے

پھر شام کی پلکیں جھکنے لگیں میداں کی سانسیں رکنے لگیں
بستی سے جو واپس آ نہ سکے جنگل کے وہ طائر یاد آئے

افتادہ زمیں، قدموں کے نشاں، سنسان مکاں، پچھلے کا دھواں
شاذ ان کا نہ تھا کچھ ذکر یہاں کس طرح وہ آخر یاد آئے

شاذ تمکنت

اترے گا

کئی کوٹھے چڑھے گا وہ کئی زینوں سے اترے گا
بدن کی آگ لے کر شب گئے پھر گھر کو لوٹے گا
گزرتی شب کے ہونٹوں پر کوئی بے ساختہ بوسہ
پھر اس کے بعد تو سورج بڑی تیزی سے چمکے گا
ہماری بستیوں پر دور تک پھیلا ہوا بادل
ہوا کا رُخ اگر بدلا تو صحراؤں پہ برسے گا
غضب کی دھار تھی اک سائباں ثابت نہ رہ پایا
ہمیں یہ زعم تھا بارش میں اپنا سر نہ بھیگے گا
میں اس محفل کی روشن ساعتوں کو چھوڑ کر گم ہوں
اب اتنی رات کو دروازہ اپنا کون کھولے گا
مرے چاروں طرف پھیلی ہے حرف و صوت کی دنیا
تمہارا اس طرح ملنا کہانی بن کے پھیلے گا
پرانے لوگ دریاؤں میں نیکی ڈال آتے تھے
ہماری دور کا انسان نیکی کر کے چیخے گا

زبیر رضوی

کتبے

مری ساری مرحوم نظموں کے کتبے
ہوا / روشنائی سے پھر لکھ رہی ہے
مگر دیکھیے! ان کہستانی قبروں کے سینے میں، جھرنوں کی لے سو رہی ہے
ادھر دیکھیے، ایک تربت کے سبزے سے ابھرے ہوئے ہیں
دلآویز دو ہاتھ دوشیزگی کے
کسی قبر پر کب سے لہرا رہا ہے
یہ کیوں خوش نما پاک مریم کا آنچل؟
یہاں سے وہاں تک بنائی گئی ہیں
بہت دل نشیں میری شہکار نظموں کی سرسبز قبریں
لہو رنگ سورج نے لکھا ہے، میری جوانی کا نوحہ، صبا کے ورق پر
نگارِ سخن سر بہ زانو ہے میرے ہی ماتم میں شاید
پہاڑوں کے سفاک درّوں کے اوپر
فقط دو جواں سال نظموں کی قبریں
بہت دور ہیں ان پہاڑوں کے الجھے ہوئے سلسلے سے
میں اس دور کا آخری نظم گو ہوں
میں اس دور کا آخری نظم گو ہوں
بہت تھک گیا ہوں! ابھی اور اوپر نہیں چڑھ سکوں گا
سحر آج بھی روشنی کے حسیں پھول لائی ہے، لیکن
پہاڑوں میں ہے اس قدر دھند حدِ نظر تک
کہ میں اپنی مرحوم نظموں کے کتبے نہیں پڑھ سکوں گا

پریم وار برٹنی

سہانے آئے ہیں

آندھیوں کے ساتھ کیا منظر سہانے آئے ہیں
آج میدانوں میں باغوں کے خزانے آئے ہیں

اب مرے تلوؤں کے نیچے کی زمیں آزاد ہے
آسمانوں سے مجھے بادل بلانے آئے ہیں

ریت سے دریا اٹے ہیں خاک سے جھیلیں پٹیں
یہ پرندے خون میں شاید نہانے آئے ہیں

ان میں روشن ہیں ابھی تک تیرے بوسوں کے چراغ
اس لئے ہم اپنی آنکھیں خود بجھانے آئے ہیں

آج ہم سب ایک بہتر زندگی کی دوڑ میں
کیسے کیسے خواب قبروں میں سنانے آئے ہیں

خواب جس دل میں رہا کرتے تھے کب کا مر چکا
کس کا دروازہ یہ بچے کھٹکھٹانے آئے ہیں

گرتی دیواروں سے لگ کر دیمکوں کے قافلے
کچھ صحیفے اپنی آنکھوں سے لگانے آئے ہیں

بارہا اس گھر کا بٹوارہ ہوا اور آج تک
اپنے حصّے میں سدا دکھ کے خزانے آئے ہیں

چار دشمن آ ملے ہیں رات کی چھت کے تلے
مدتوں کے بعد پھر اگلے زمانے آئے ہیں

بشیر بدر

خواب ہوا ہے

اندھی موجو! کون سی رت ہے، دل کا سکوں کیوں خواب ہوا ہے
قطرہ کیوں طوفان بنا ہے۔ ساحل کیوں گرداب ہوا ہے
چھوٹی چھوٹی باتوں میں یہ خنجر سی کاٹ آئی کہاں سے
چنچل من کا گہرا ساگر کیوں اتنا پایاب ہوا ہے
لہجے کو کتنا ہی سنوارو، کوئی فسانہ چھیڑو لیکن
بہکی بہکی باتوں میں جو رس تھا، وہ نایاب ہوا ہے
پچھلے پہر کے آتے آتے عالم کیا ہوگا، کیا جانے
شام ہی سے بھیگی پلکوں کا، ویرانہ شاداب ہوا ہے
سر سے اوپر پہنچا پانی۔ کون پڑھے چہروں کی کہانی!
امڈا ہے آنکھوں کا دو آبہ، دل کا نگر غرقاب ہوا ہے
ننھا سا وہ ایک ستارہ تھا جو افق پر سہما سہما
رفتہ رفتہ آئی جوانی رات پہ تو مہتاب ہوا ہے
حرمت ریت کی اونچی جگ مگ ہم کو کیا بھٹکاتی لیکن
کتنی قاتل ہے یہ پیاس کہ امرت بھی زہراب ہوا ہے

حرمت الاکرام

رکھے نہیں ہیں

ہوا بدلی وہ دن رکھے نہیں ہیں
درختوں کے تلے سائے نہیں ہیں
انہیں چھو کر غموں کی دھوپ سینکو
یہ پیکر برف ہیں شعلے نہیں ہیں
فضا باغوں کی سہمی سردیوں سی
گلوں کے رنگ جب پھیکے نہیں ہیں
یہ مانا تھے سفر میں ساتھ میرے
مگر وہ یار اب بچتے نہیں ہیں
کہاں خودداریاں اپنی ڈبوئیں
سمندر بھی بہت گہرے نہیں ہیں
خموشی کا انہیں ہے پاس فکری
یہ پتھر بے زباں بہرے نہیں ہیں

پرکاش فکری

پک رہی تھی

جب دھوپ میں فصل پک رہی تھی
ہر آنکھ چمک دمک رہی تھی
شیشے میں تھا ساعتوں کا پرتو
پتھر میں صدی جھلک رہی تھی
جب آگ میں ہم پنہ گزیں تھے
انگار کو برف ڈھک رہی تھی
احساس کی لَو گھٹا لی میں نے
میری ہی طرف لپک رہی تھی
روشن تھے جہاں قلوب اتنے
اک روح وہاں بھٹک رہی تھی
سرحد کی لکیر دیکھ آئے
خنجر کی طرح چمک رہی تھی
آئینہ اوج نے دکھایا
پستی مری راہ تک رہی تھی
میدان غبار سے اٹا تھا
تلوار لہو چھڑک رہی تھی

غلام مرتضیٰ راہی

مگر رہ جائے گا

جو بھی کہئے جس طرح کہئے مگر رہ جائے گا
کچھ نہ کچھ یعنی پس عرضِ ہنر رہ جائے گا
عمر بھر پانا ہے اس کو پا کے کھونا ہے یوں ہی
ہر سفر کے بعد اک لمبا سفر رہ جائے گا
میں بھی اس سے کہہ نہ پاؤں گا جو کہنا ہے مجھے
وہ بھی میرے سامنے کچھ سوچ کر رہ جائے گا
اور تو سب پیڑ جل جائیں گے غم کی دھوپ سے
صحنِ دل میں اس کی یادوں کا شجر رہ جائے گا
تہہ نشیں ہو جائیں گی دم بھر میں ساری صورتیں
سطحِ آئینہ پہ اک عکسِ دگر رہ جائے گا
شام سے پہلے ہی اختر قریۂ جاں سے نکل
ورنہ تنہائی میں تو بھی ٹوٹ کر رہ جائے گا

سلطان اختر

انتشار کتنا

ہوائے نیم بستہ تن میں ہے انتشار کتنا
بتا کہ دیکھوں نظر پہ ہے اعتبار کتنا
قدم ہیں سیدھے مگر دلوں میں یہ خوف کیسا
سڑک ہے شیشہ مگر نظر میں غبار کتنا
حصار گرد و غبار بکھرا کہ نقش بولے
تجھے تھا موسم بدلنے کا انتظار کتنا
میں پا پیادہ ہوں دشت بھر تھا مکاں میرا
جو ہم سفر تھا مرا وہ تھا شہسوار کتنا
وہ لوگ سنگ دہن ہٹا کر بڑے ہی خوش تھے
لڑھک گئے تو لگا کہ تھا گہرا غار کتنا
زبان گل بار کتنی خوش رنگ و نرم و نازک
ہے خنجر لفظ ذہن کے آر پار کتنا
سمندروں پر ہے حرف سوکھا ہوا جزیرہ
ہے قطرہ لیکن وجود میں بے قرار کتنا
ہزارہا سال تک چلیں گے زمین سورج
اب اس سے بڑھ کر کرے گا وہ اختصار کتنا
میں ڈوب کر تیر کر بھی منظور بے خبر ہوں
لہر لہر ہے چڑھاؤ کتنا اتار کتنا

حکیم منظور

بچھا بھی دے

ردائے خاک طلب دور تک بچھا بھی دے
برہنہ راہ کو پیراہن صدا بھی دے
میں ایک سادہ ورق ہوں تری کہانی کا
جو ہو سکے تو مجھے داستاں بنا بھی دے
تھکی نگاہوں میں روشن ہو حوصلوں کی چمک
نڈھال قدموں کو منزل کا آسرا بھی دے
ہمارے درمیاں حائل ہے دشمنوں کی طرح
جو ہو سکے تو یہ دیوار خود ڈھا بھی دے
جنم جنم سے خود اپنی تلاش میں گم ہیں
ہم اہل درد کو ہم سے کبھی ملا بھی دے
تمہاری یاد کا جب صحن دل میں چاند کھلے
اداس شام کو منظر سا کچھ نیا بھی دے

شام رضوی

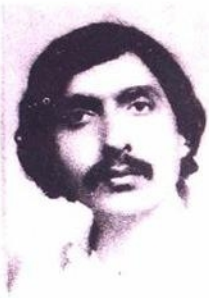

فرخ جعفری

غلام مرتضیٰ راہی

سلیم شہزاد

اختر یوسف

اشاریہ

(الف)

اعجاز صدیقی ۶۱
اختر الایمان ۷، ۱۰، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰
آزاد گلاٹی ۲۰
اختر یوسف ۱۳۷
باقر مہدی ۲۶، ۳۵
بلراج کومل ۱۶، ۱۷، ۱۱۱، ۱۱۲
باقی ۵۵، ۱۱۳
بشر نواز ۵۷، ۷۳
بشیر بدر ۲۹، ۱۵۰
پریم وار برٹنی ۷۵، ۱۴۹
پرکاش فکری ۳۰، ۱۵۲
جگن ناتھ آزاد ۱۵
حامدی کشمیری ۹۰، ۱۲۶
حرمت الاکرام ۱۵۱
حکیم منظور ۱۲۸، ۱۵۴
حمید سہروردی ۱۰۲، ۱۰۳
خلیل الرحمٰن اعظمی ۲۵، ۶۵، ۶۶، ۶۷
خورشید الاسلام ۴۶، ۴۷، ۴۸
راج نرائن راز ۷۷، ۱۲۱
زبیر رضوی ۳۸، ۳۹، ۴۰، ۱۴۸
زیب غوری ۱۲۰، ۱۴۳
زاہدہ زیدی ۸۷
سردار جعفری ۶۲، ۶۳، ۶۴
ساجدہ زیدی ۴۹، ۱۴۲
سلطان اختر ۹۲، ۱۵۵
سلیم شہزاد ۴۲
ساغر ۲۲
ساحل احمد ۱۳۲، ۱۴۴
شاذ تمکنت ۸۶، ۱۴۷
شمس الرحمٰن فاروقی ۸۳، ۸۴، ۸۵، ۱۱۴، ۱۱۵
شفیق فاطمہ شعریٰ ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴
شہریار ۵۶، ۱۳۶
شمیم حنفی ۱۰۴
شمیم فاروقی ۱۳۱
شام رضوی ۱۵۶
ضیا فتح آبادی ۱۲۵
عمیق حنفی ۱۰۰
عادل منصوری ۳۶، ۳۷
عصمت جاوید ۱۲۹
عتیق اللہ ۹۳
عنوان چشتی ۳۱، ۱۳۰
عبداللہ کمال ۳۲
عقیل جامد ۲۱

غلام مرتضیٰ راہی ۱۲۷، ۱۵۳
فضا ابن فیضی ۴۵، ۱۴۱
فرخ جعفری ۹۴
قاضی سلیم ۶۸، ۶۹
کمار پاشی ۲۷، ۲۸، ۷۴
کرشن موہن ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۳۵
کرامت علی کرامت ۸۰
کرشن کمار طور ۱۳۸
لطف الرحمٰن ۱۹
مظہر امام ۷۸، ۸۹
محمد علوی ۵۰، ۵۱، ۵۲
مخمور سعیدی ۸۸، ۱۱۸، ۱۱۹
مظفر حنفی ۹۔
ندا فاضلی ۴۱، ۱۰۱
نازش پرتاب گڈھی ۵۸
نوبہار صابر ۷۶
وحید اختر ۷۰، ۷۱، ۷۲، ۹۷، ۹۸، ۹۹
وہاب دانش ۱۸، ۹۱

(ب)

غزل: ۱۸، ۱۹، ۲۱، ۲۲، ۲۵، ۲۹، ۳۰، ۳۱، ۳۲، ۴۲، ۴۵، ۵۵، ۵۷، ۶۱، ۷۶، ۷۷، ۷۸، ۷۹، ۸۰، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۲، ۹۴، ۱۰۴، ۱۱۳، ۱۲۱، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۸، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۶،

نظم: ۱۵، ۱۶، ۱۷، ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۳۵، ۳۶، ۳۷، ۳۸، ۳۹، ۴۰، ۴۱، ۴۶، ۴۷، ۴۸، ۴۹، ۵۰، ۵۱، ۵۲، ۵۶، ۵۸، ۶۲، ۶۳، ۶۴، ۶۵، ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۶۹، ۷۰، ۷۱، ۷۲، ۷۳، ۷۴، ۷۵، ۸۶، ۸۷، ۹۱، ۹۳، ۹۷، ۹۸، ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۹، ۱۳۷، ۱۴۲، ۱۴۹

رباعی: ۸۳، ۸۴، ۸۵

(ج)

آج کل: ۱۴۹،

آہنگ: ۷۹، ۸۷، ۸۸، ۱۳۵
الفاظ: ۱۸، ۹۸، ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۴، ۱۳۸
بیسویں صدی: ۸۰
تناظر: ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲،
تحریک: ۴۲، ۵۸، ۱۰۲، ۱۱۳، ۱۱۸، ۱۱۹
سطور: ۲۵، ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۰، ۵۶، ۵۷
شب خون: ۱۵، ۱۶، ۱۷، ۱۹، ۲۰، ۲۱، ۲۲، ۴۵، ۴۶، ۴۷، ۴۸، ۴۹، ۵۰، ۵۱، ۵۲، ۸۳، ۸۴، ۸۵، ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۹۲، ۹۳، ۹۴، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۴۳، ۱۴۴،
شاعر: ۳۱، ۳۲، ۶۱، ۶۲، ۶۳، ۶۴، ۶۵، ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۶۹، ۷۰، ۷۱، ۷۲، ۷۳، ۷۴، ۷۵، ۷۶، ۷۷، ۷۸، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴
معیار: ۳۶، ۳۷، ۳۸، ۳۹، ۴۰، ۴۱، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۶
ہم زبان: ۸۶، ۱۴۱، ۱۴۲
جواز: ۳۵، ۱۰۱

(د)

نیا آہنگ: ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰
دھوپ اور چاندنی: ۱۲۵

پس دست

اقبال اور غزل	تنقید	ساحل احمد
یازدہ	تنقید	ساحل احمد
موسم	شاعری	ساحل احمد
۱۹۷۸ء کا شعری ادب	شاعری	ساحل احمد

اور

جدید ادب کی چار جلدیں

نئی غزل — نئی نظم

نئی تنقید — نئی کہانی

پیش دست

اقبال ایک تجزیاتی مطالعہ	تنقید	ساحل احمد	۶/-
اضافی تنقید	تنقید	کرامت علی کرامت	۳۰/-
غزل پس منظر پیش منظر	تنقید	ساحل احمد	۲۸/-
۱۹۷۷ء کا شعری ادب	شاعری	ساحل احمد	۱۵/-

اردو رائٹرس گلڈ

الہ آباد / ۲۱۱۰۰۳

شمیم فاروقی

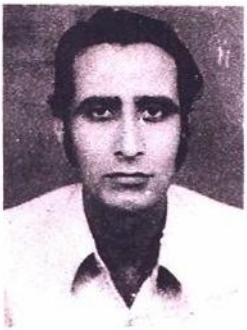

عقیل جامد

ساحل احمد

لطف الرحمن

کرشن کمار طور

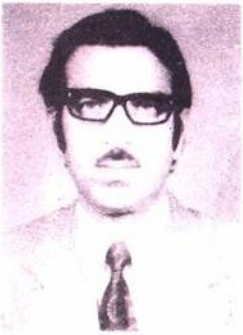

حامدی کشمیری

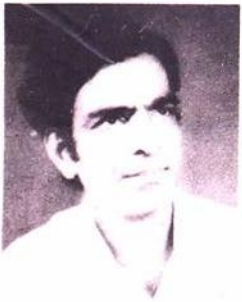

کمار پاشی

ساغر

لفظ

فنون لطیفہ کی سب سے زیادہ منظم اور مہذب صورت ادب کی ہے جو انسانی درک و بصیرت اور احساس و آگہی کا موزوں ترین ذریعہ اظہار ہے۔ جس کا سب سے لطیف و نازک احساس جزو، شاعری ہے جو ہماری روحانی، وجدانی اور جمالیاتی کیفیات کی تسکین کا ذریعہ ہے۔ جس کی جڑیں ہماری تہذیب و تمدن کی نامعلوم گہرائیوں تک پیوست ہیں۔ اس میں زندگی کی چبھن، نشاط و سرخوشی، دردمندی، آشفتگی، دل نوازی، سادگی و سپردگی اور فکر و تخیل کی رفعت و پاکیزگی اور عرش و فرش کے سارے مسائل کا بیان موجود ہے۔

شاعری کے موضوعات و رجحانات میں جو زمانی تضاد یا افتراق ملتا ہے وہ اس کی فطری اور صدیوں کی تحریک کی دین ہے۔ اس کی تبدیلی یا تغیر پسندی کسی معجزیاتی فکر سے وابستہ نہیں کیوں کہ یہ چیز زمان و مکاں کے تمدنی اور تہذیبی ماحول کے زیر اثر تخلیق پاتی ہے جو ایک طرح سے شعر کی ضرورت ہے۔ اور شعری اساس انہیں روایت و آگہی پر انحصار کرتی ہے اور اپنی سیمابیت کے باعث ہر زمانہ میں اقتضائے وقت کے مطابق خود کو بدلتی، سنوارتی اور نکھارتی رہتی ہے۔ حالاں کہ کسی نوع کی بھی خصوصیت یا خوبی کسی لمحاتی برانگیختگی کے نتیجہ میں نہیں پیدا ہوتی۔ اس لئے کسی تخلیقی عمل میں شاعر کی شخصیت، اس کی سوجھ بوجھ، اس کی نوبینا اور اس کی طرفگی کی شمولیت ضروری ہے۔ اور اس میں شعور و آگہی کی موثرانہ اور کیفیانہ ارتسام واجب ہے۔ چوں کہ

توڑا ہے اس جمود کو کتنے خلوص سے
اتنا اثر تو خامۂ تحریر سے ہوا

باطنی اور ظاہری انعکاس کی صورت تضاد پیدا کرتی ہے۔ اور یہی تضاد زندگی کے متضاد معنی میں مستعمل ہے۔ حالات جن تبدیلیوں کے متقاضی ہوتے ہیں اسی کے بہ موجب شاعری اس کا اثر سویکارتی ہے۔

شاعرانہ تخیل کی پشت در پشت ہیجانی کیفیت جو نہ صرف اپنے حال سے بل کہ ماضی کے گزشتہ لمحات سے بھی وابستہ ہوتی ہے جس کے ذریعہ حال کی تصویر اور مستقبل کی نقش آرائی کی جا سکتی ہے مگر ایک اچھے شعر کے لیے فکری تسلسل یا معنوی ربط بہت ضروری ہے کیوں کہ لفظوں کے مرتب آہنگ سے ہی شعر کی تخلیق ہوتی ہے اور شعر انہیں لفظوں کی مرتب شدہ اکائی ہے جن کے باہمی اور معنوی ربط سے شعریت یا کیفیت پیدا ہوتی ہے جسے خاموش نغمہ یا شاعرانہ تجربہ کی آتما یا خیال کی بھوک کہہ سکتے ہیں شعر کی یہی متصوف فکر معنوی وصف کو ظاہر کرتی ہے مگر روح حقیقی کا حسن یا معنوی بصیرت اسی وقت ممکن ہے جب کوئی خیال کسی خاص انداز میں نظم کیا گیا ہو اور اس کے اقتضاء کا یہ طور خاص خیال رکھا گیا ہو کیوں کہ موزونی طبع شعر کی تخلیق تو کر سکتی ہے مگر روح حقیقی کا حسن یا وصف خصوص پیدا کرنا اس کے دائرہ اختیار سے باہر کی چیز ہے۔

تہذیبی و تمدنی ارتقاء کے ساتھ شعر کی نوعیت میں بھی تبدیلی پیدا ہوئی اور اس کی معنویت میں بھی اضافہ ہوا لیکن اس کی بنیادی خصوصیات یعنی خارجی و داخلی میں کوئی فرق

واقع نہیں ہوا۔ اس میں مجموعی اور انفعالی دونوں کیفتیں موجود ہیں جس سے نہ صرف موضوع کی یکسانیت اور اسلوب کی قدیمانہ روش کا فرق واضح ہوتا ہے بل کہ شاعری کے نئے امکانات ومیلانات کے اجتہادی رویہ کا بھی سراغ ملتا ہے۔ سال گزشتہ کی شاعری لسانی تغیرات اور لفظی ترک و قبول کی نکتہ رسی کا ثبوت فراہم کرتی ہے جس میں زندگی اور سماجی آگہی بھی ہے اور مواد وہیت کی اختراعی جدت بھی۔ فرد کی ذات، اس کے مسائل، اس کی داخلی کش مکش، اس کی نفسیاتی پیچیدگی، کائنات وحیات کا رشتہ، تہذیبی وتمدنی اور معاشرتی ڈھانچہ اور زندگی کی بدلتی ہوئی قدریں اور اجتماعی شعور کی تمام ذہنی و نفسی قوتیں جدید شعری رویہ کی وہ مثبت پہچان ہیں جو فرد کی انفرادی حیثیت کو نہ صرف نمایاں کرتی ہیں۔ بل کہ ماورائی اصلیت وصداقت کا آزادانہ اظہار بھی ہیں۔

مشرق وسطیٰ کے مسائل، افریقہ کے معاملات، پاس پڑوس کے ملکوں کے سیاسی حالات، جوہری اسلحہ کی دوڑ دھوپ، نسلی برتری کا زعم، دوستی واخلاق کو مٹانے والی علامتیں، سیاروثوابت پر ڈالی جانے والی کمندیں، ایٹمی تجربات، ایٹمی خوف کی جبریت، آزادی وغلامی کی نئی وضع کاری، آدرشوں کا فقدان، صنعت وسائنس کے تاریک وروشن پہلو اور مشینی آلات میں دبا ہوا آدمی ایسی حقیقتیں ہیں جن سے آنکھ نہیں چرائی جا سکتی اور نہ موجودہ زندگی اور وقت کی تیز رفتاری پر روک لگائی جا سکتی ہے۔ چنان چہ آج کے حالات ومعاملات

کے پیش منظر میں ان تخلیقات کا مطالعہ اور محاسبہ ضروری ہے۔ گو کہ ان کے بارے میں کچھ کہنا ابھی قبل از وقت معلوم ہوتا ہے مگر اردو شاعری کی موجودہ رفتار اس کی نفسیات اور اس کے امکان و مرتبہ کے سلسلے سے کسی نہ کسی نوع کی خیال آرائی ضروری بھی ہے انتخاب خواہ۔ نئے ادب کا ہو یا پرانے ادب کا۔ ہر کوئی اس سے مطمئن نہیں ہو سکتا اور نہ ہر انتخاب یکساں قدر و قیمت کا حامل ہو سکتا ہے کیوں کہ ہر انتخاب کی نوعیت جداگانہ حیثیت رکھتی ہے مگر یہ کہنے میں مجھے قطعی تامل نہیں کہ پیش دست انتخاب گروہی عصبیت سے پاک و صاف ہے۔ تقریبین ہر مکتبۂ خیال کی نمائندہ شخصیتوں کی بہتر سے بہتر چیز شامل کی گئی ہے۔ جدید و قدیم ادب کی بحث سے قطع نظر یہ میرا آزادانہ انتخاب ہے۔ ہاں البتہ پرانی نسل یا پرانے موضوعات کے مقابلہ میں نئی نسل کے زیادہ ذہین لکھنے والوں یا عصری حسیت سے معمور تخلیقات کو اولیت دی ہے۔ اختر الایمان اور ضیاء فتح آبادی کے کلام سے قطع نظر تمام تخلیقات ہندوستانی رسائل سے منتخب کی گئی ہیں۔ جو نہ صرف تازہ و شگفتہ ہیں بل کہ تجرباتی ہونے کے باعث سنگ میل کا بھی کام دیتی ہیں۔ اس اشاعت میں شعراء کا خلوص اور مدیران کی محبت شامل ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آئندہ بھی ان کی معاونت حاصل ہوگی اور وہ میرے دوش بہ دوش ہوں گے۔

۳۰/۶

الہ آباد

جنوری

شہکار جمیل
برگ صدا
دیوار ہے اف
فضا میں قید تھا
برابر کون تھا
معکوس تھا
شاق ہے کیا

شہکارِ جمیل

نامکمل رہ گیا فطرت کا اک شہکار پھر
ایک شہکارِ جلیل
ایک شہکارِ جمیل
ایک نظم —
ناز سے ہے سوز جس میں، نور سے تاباں ہے جو
اک غزل —
زندگی کے ساز پر رقصاں ہے جو
اک کہانی جس میں بادل کی گرج ہے اور بجلی کی کڑک
تند شعلے کی بھڑک
صبحِ گلشن کی خموشی، شامِ صحرا کا سکوت
دل کی دنیا کا سکوت
کوہساروں کا جلال
لالہ زاروں کا جمال
یہ کہانی! یہ غزل، یہ نظم، ابھی تکمیل کی منزل کو پہنچی تھی کہاں
نوکِ نشتر، وہ جو خونِ دل میں تھی ڈوبی ہوئی، شاید ابھی تک تھی رواں
کہتے کہتے یہ کہانی سو گیا افسانہ خواں
نامکمل رہ گیا فطرت، ترا شہکار پھر

جگن ناتھ آزاد

برگ صد ۱

آسماں، نیل گوں، اس کا سایہ حسیں
اُس کے سائے میں رنگ شجر سبز، چڑھتی ہوئی،
دھوپ سیال سونا، وہ چہرہ نگیں
ایک منظوم منظر، کنارے سے خام، تجرید کی

کوکھ سے جنم لیتے تراشیدہ بازو، پریشان گیسو، لب نیم جاں
چشم روزن کی وحشت کا بھرا ہوا
زرد عفریت، مارسیہ، کینچلی
دانت، جبڑے، شکستہ ستاروں سے گرتے ہوئے گیت، ہیں
ہم سفرا جنبی کا، وہ میرا، مرے
جادۂ بے صدا کے غبار تمنا کا بادل، ہیں اڑتا ہیولا یا آہو
کی رفتار کا کوئی چربہ

یہ منظر کو کیا ہوگیا
اس میں دم توڑتے نفس کی منجمد
گرد آلود آنکھیں، سر شاخ گل
منتظر ہیں حریف نوا کی جو کل تک نہ آیا، جو کابوس کے پھچاتے ہوئے
چار خنجر سربام آویزاں کرکے کئی روز پہلے یہاں سے کہاں چل دیا
آسماں نیل گوں تھا عجب چیتھڑا
خاک دخوں نے بنا
بار شام و سحر
ایک خرگوش کے نیم جاں جسم پر آگیا
خامشی کہہ رہی ہے کہ برگ صدا
گر چکا، مٹ چکا
آج آزاد ہو
حشر تک اب تسلسل میں بہتی رہی
گرم سفاک اندھی پریشان پاگل ہوا

بل راج کومل

دیوار ہے اُف

اب کدھر جائیں یہاں سمت ہی دیوار ہے اُف
جس اشارے پہ اٹھی آنکھ گرفتار ہے اُف

خانہ خانہ ہے ہر اک سجدہ ، ہر اک سر تقسیم
یہ زمیں صدیوں سے بس یونہی صنم زار ہے اُف

شعلہ شعلہ ہے قدم ریت سفر ریت ہی ریت
اس تگ و دو میں یہاں کون شرر بار ہے اُف

نرم آواز کی تفسیر ہمیں لے ڈوبی
زرد آنکھوں کی صدا جان کی آزار ہے اُف

گرد خواہی کی دعا کس نے سجائی لب پر
کیوں ہر اک لمحہ زمیں دھوم سے سرشار ہے اُف

بس وہی آدمی اندر سے ابلتا "میں" ہوں
جو نفی کرتا ہر اثبات کا ، انکار ہے اُف

کون رہ رہ کے مری بوند سے ہوتا ہے بلند
یہ لہو کس کا اگلتی ہوئی تلوار ہے اُف

وہاب دانش

فضا میں قید تھا

ابر دریا سے اٹھا تھا اور فضا میں قید تھا
اک اسیر آب زنجیر ہوا میں قید تھا
آسماں کی الگنی پر سوکھتی چادر تھے خواب
میں زمیں کی گود میں رہ کر خلا میں قید تھا
مجھ کو صحرا کی جہاں گیری مقدر ہوگئی
میں غباروں کی طرح کس کی ادا میں قید تھا
اجنبی شہروں میں، بے گانہ خود اپنے گھر میں تھا
کس کا مجرم تھا وہ یہ کیسی سزا میں قید تھا
جل بجھا وہ اپنے گھر کے ساتھ اپنی آگ میں
وہ لہو کا نوحہ گر اپنی انا میں قید تھا
سات رنگوں کی کماں ٹوٹی تھی میرے جسم میں
ذائقہ بجھتی ہوئی رت کا صدا میں قید تھا
پھول تو شاخوں کی زنداں سے رہائی پاگئے
خوش بوؤں کا پیرہن بادِ صبا میں قید تھا

لطف الرحمٰن

سحال احمد

برابر کون تھا

میں اگر خود میں نہیں ، میرے برابر کون تھا
میرے باہر کون ہے اب، میرے اندر کون تھا
اس کی آنکھوں میں تھی گزری ساعتوں کی اک جھلک
جس کا پس منظر تھا یہ ، آخر وہ منظر کون تھا
میرا سایہ بن کے دن بھر جو ڈراتا تھا مجھے
آستیں میں جس کی تھا دہشت کا خنجر کون تھا
میں اگر اک جسم تھا تو آسماں پر کیوں گیا
اور اگر اک روح تھا تو میرے گھر پر کون تھا
دے کے خوابوں کے سہانے پھول میرے ہاتھ میں
دے گیا جو مجھ کو تعبیروں کے پتھر کون تھا
کس کی آسیبی صدا لرزاں تھی میرے ذہن میں
جو بلاتا تھا تہ آب سمندر کون تھا

آزاد گلاٹی

معکوس تھا

خواب ہر اک ذہن نا ہم وار کا معکوس تھا
شاخ پر مسکن گزیں بط، جھیل میں طاؤس تھا

معرکہ ایسا ہوا تھا اک شعاع تیز سے
ایک لمبی عمر تک میں برف میں محبوس تھا

چشم دنیا میرے حق میں ہوگئی تھی عکس ریز
جسم میرا جامہ پوشی میں بھی بے ملبوس تھا

اشتعال انگیزیوں میں کچھ کمی میں نے نہ کی
پھر بھی کیوں مجھ سے مزاج مشتعل مایوس تھا

کیوں بھلا کھلتے نہ دنیا پر مرے عیب و ہنر
میرے پیچھے وقت جو سب سے بڑا جاسوس تھا

طمع خصلت میری خاطر جنگ پر آمادہ تھے
اور میں مال غنیمت کی طرح محروس تھا

مجھ کو شاعر کہنے میں جامد انھیں تھا پیش و پس
چوں کہ میری طرز، میرا لہجہ نامانوس تھا

عقیل جامد

شاق ہے کیا

موجودہ تفاد شاق ہے کیا
خنظل سے بھرا طباق ہے کیا
ان مشترکہ صعوبتوں میں
تسکین ہوس مذاق ہے کیا
آمادہ ہے شور و غل پہ مساطر
اجگر کے دہن میں ساق ہے کیا
قرنوں کی علانیہ روش پر
ساعات کا اتفاق ہے کیا
تھا جو درد زباں صحیفہ
مدت سے رہین طاق ہے کیا
دشمن کی شدید گرم جوشی
یاروں کی نظر میں شاق ہے کیا
تیزاب میں کیوں گہر ڈبو دیں
ساغر ہم میں نفاق ہے کیا

فروری

کیا کریں
ایک کالی نظم
نظم شریف زادوں کے لئے
چرا کر لے جائے
بجھا دیں
کرے یہاں
ناگہانی میں مخفی

کیا کریں

درمیاں خود اپنی ہستی ہو تو ہم بھی کیا کریں
آئینہ دیکھیں کر اپنے آپ سے پردا کریں
ایک سے لگتے ہیں سب ہی، کون اپنا، کون غیر
بے نقاب آئے کوئی تو ہم در دل وا کریں
حال کے سیلاب میں تو بہہ گئی ماضی کی لاش
دفن اب کس کی گلی میں ہم غم فردا کریں
ایک دو پل ہی رہے گا سب کے چہروں کا طلسم
کوئی ایسا ہو کہ جس کو دیر تک دیکھا کریں
کیوں نہ اپنا ہی لہو پی کر بجھائیں دل کی پیاس
کس کے گھر کا بھید کھولیں، کس کو ہم رسوا کریں
اب تو امڈا ہی چلا آتا ہے سیل آتشیں
چشم تر! ہم کس طرح سے پار یہ دریا کریں
یہ تو سچ ہے زہر لگتے ہیں ہمیں بستی کے لوگ
کس توقع پر مگر آباد ہم صحرا کریں
پاس اپنے کیا رہا بس اک عذر مفلسی
اس کی کیا قیمت لگائیں، اس کا کیا سودا کریں
سرپھرے سب جمع ہوں، سب کے سروں پر ہوں چراغ
بس چلے تو ہم بھی ایسا جشن اک برپا کریں

خلیل الرحمٰن اعظمی

ایک کالی نظم

بے کسی خشک سیاہی کو جنم دیتی ہے
اور کاغذ کی سفیدی میں نہاں تحریریں
مجھ کو اک دیدۂ حیراں کی طرح
تکتی ہیں!

ذہن میں ٹھہری ہوئی اک آندھی
دل میں چپ چاپ سمندر۔ صحرا

کیسی ان جانی تحریریں
خوف سے ڈر کے ابھر آئیں گی؟
نظریں کاغذ پہ مگر ڈھونڈیں گی
صرف احساس ہی پڑھ پائے گا

——— اور رگ رگ میں
خلش بن کے خموشی ——— دھڑکن
جسم میں سہمے ہوئے خواب
رینگ کر آنکھوں سے باہر نکلیں
اور ٹکرا کے سلّط ——— دہشت
ریزہ ریزہ مری رگ رگ میں چبھن بن جائیں!

باقر مہدی

شریف زادوں کے لئے

۱

مجھے یاد ہے اب سے کچھ دیر پہلے
کوئی کہہ رہا تھا:
وہ لڑکی کئی سال سے
اپنے بستر پہ تنہا نہیں سو سکی ہے
سنا ہے کئی سال پہلے
وہ ماں سے بچھڑ کر
کہیں دور کے ریگ زاروں میں گم ہو گئی تھی
لباس اس کا اب
میرے گاؤن میں الجھا ہوا ہے
میرے بستر کے بالکل قریب
اک تپائی پہ رکھا ہوا ہے
وہ کیچڑ میں لت پت
ہمیشہ کی مانند
ہر لمحہ بڑھتے ہوئے
بوجھ کو ڈھو رہی ہے
کسی بے زباں جانور کی طرح

سالہا سال سے

یوں ہی چپ چاپ سی
اپنے ہی جسم کے
گوشت کو اوڑھ کر
سو رہی ہے
یوں ہی ـــ سالہا سال سے

۲

اس نے پچھلے کسی جنم میں
ناگ راج کا سر کچلا تھا

جنم جنم سے
ناگن اس کو ڈھونڈ رہی ہے

جنم جنم سے
وہ خود سے چھپتا پھرتا ہے
اپنے ہی مردار بدن میں
ایسا کونہ ڈھونڈ رہا ہے
جس کے باہر اس کے لہو کی
گندھ نہ جائے
ناگن اس کو ڈھونڈ نہ پائے

سچ کہتا ہوں
جنم جنم سے
میں خود سے چھپتا پھرتا ہوں

کمار پاشی

چرا کر لے جائے

خواب ان آنکھوں سے اب کوئی چرا کر لے جائے
قبر کے سوکھے ہوئے پھول اٹھا کر لے جائے

منتظر پھول میں خوشبو کی طرح ہوں کب سے
کوئی جھونکے کی طرح آئے اڑا کر لے جائے

یہ بھی پانی ہے مگر آنکھوں کا ایسا پانی
جو ہتھیلی پہ رچی مہندی چھڑا کر لے جائے

میں محبت سے مہکتا ہوا خط ہوں مجھ کو
زندگی اپنی کتابوں میں دبا کر لے جائے

خاک انصاف ہے نابینا بتوں کے آگے
رات تھالی میں چراغوں کو سجا کر لے جائے

بشیر بدر

تہذیب
ساحل احمد
آرائش
ذوالفقار صدیقی
خوش نویس
وقار

اشاعت اوّل:
اپریل ۷۸
اشتراک:
پندرہ روپیہ
مطبع:
اسرار کریمی پریس، الہ آباد
چہرہ:
اینگل پرنٹرس، الہ آباد

ناشر:
اردو رائٹرس گلڈ
مراسلت
ای۔سی۔سی

بجھا دیں

اندھیرا ہے چراغوں کو بجھا دیں
چمکتی دھوپ کی یادیں بھلا دیں
کہانی یہ سبھوں کو لطف دے گی
اسے کچھ اور بھی رنگیں بنا دیں
جہاں سے ہر صدا ناکام لوٹی
کہو تو ہم اسی در پہ صدا دیں
نکلتی ہیں کئی راہیں یہاں سے
تمھیں کس سمت کا بولو پتہ دیں
گریں گے رات کی شبنم کے موتی
ذرا ان سبز شاخوں کو ہلا دیں
گزرتے ہیں یہ لمحے خامشی سے
مگر ایسے کہ نیندیں ہی اڑا دیں
جلائیں گے یہ جی کو اور فکری
یہ سوکھے پھول دریا میں بہا دیں

پرکاش فکری

کرہے یہاں

درد اوروں کا مرے درد سے بڑھ کر ہے یہاں
کیسے ان رشتوں کو توڑوں کہ ستم گر ہے یہاں

ہائے بستر پہ بچھی ہے مرے جلتی ہوئی رات
اور آنکھوں میں مری خواب سا پیکر ہے یہاں

روز تصویر بناتا ہوں، مٹا دیتا ہوں
"آئینہ" اپنی ہی آنکھوں پہ مقدر ہے یہاں

کتنے ارمانوں کی لاشوں پہ بسایا ہے اسے
ہائے یہ شہر کہ ہر قبر پہ "پتھر" ہے یہاں

دل بھی خالی سے ہیں، ہر آنکھوں کی بجھوی کی طرح
اور کہنے کو ہر اک شخص سکندر ہے یہاں

زندہ رہنا ہے تو پھر کیوں نہ خدا بن جاؤں
"ہے یہ وہ شہر" کہ ہر شخص پیمبر ہے یہاں

صرف آسودگی دل ہی نہیں ہے، عنوان
خیر سے یوں تو ہر آرام میسر ہے یہاں

عنوان چشتی

ناگہانی میں تھی

وہ صدائے سفر ناگہانی میں تھی
سمت پرواز اب بے نشانی میں تھی
اک خبر بن گئی، جو کہانی میں تھی
کس کو معلوم تھا آگ پانی میں تھی
میں تھا محفوظ کشتی میں بیٹھا ہوا
میری کشتی مگر گہرے پانی میں تھی
وہ مجھے دیکھ کر سوچ میں پڑ گیا
میری تصویر اس کی کہانی میں تھی
اس کی وسعت میں سمٹا ہوا تھا افق
اور مری دست رس بے کرانی میں تھی
جزو و بر کی حدیں گم تھیں مجھ میں کمال
میری پہچان تو لامکانی میں تھی

عبداللہ کمال

مارچ

نئے لفظ کی جستجو میں
گاؤں تالاب رہٹ راشن کارڈ
لہو سبز سیلاب آوا گمن
بشارت پانی کی
پرندے لوٹ آئے
نئی ڈائری کا پہلا ورق
اظہار میں بھی ہوں

نئے لفظ کی جستجو میں

ایک نسخہ ملا
"نئے لفظ کی جستجو میں
وہی بات کہنے سے حاصل؟
سب سے پہلے مغربی فکر کے شوخ جالوں کو توڑ دو
اور مشرقی خود فریبی کی دل دل سے نکلو
اک نئی کش مکش ـــ خود بہ خود سخت مٹی سے
ایک فوارہ بن کر ـــ سیراب کرنے کی کوشش کرے گی
اور بنجر زمین پر بیر بہوٹیاں
ہری گھاس کی کونپلیں لے کے آئیں گی ـــ"
"یہ نسخہ پرانا ہے" ـــــ میں نے ڈائری میں لکھا
"ـــــ شاید اب کے ٹکراؤ میں قیامت سے آگے کی وادی میں جانا پڑے گا
اور ممکن ہے یوٹوپیا ـــــ خوابوں کی کھڑکی سے کود کر
نئے استعارے ـــــ تراکیب، معنی و مفہوم کا اک جزیرہ بسائے ـــــ!"
ـــــ اور میرا یہ انقلابی یقیں ـــ صبح تک پارہ پارہ ہونے سے بچ بھی گیا
تو مجھے اور پاگل بنا کر رہے گا!

باقر مہدی

گاؤں تالاب رہٹ راشن کارڈ

گاؤں تالاب رہٹ راشن کارڈ
آسمانوں سے برستے ہوئے گندم گوہر
چیونٹیاں اور مکوڑوں میں طلب طغیانی
پیٹھ کی سوکھی ہوئی چمڑی سے سورج چسپاں
دھوپ میں تپتی ہوئی مونگ پھلی محرابیں
غار میں سوئے ہوئے لوگوں کی آنکھیں بے خواب
خوف کی رات پگھلتی ہی نہیں
کوئی مشعل کہیں جلتی ہی نہیں
بھاگتے لوگوں کا کہرام کھنک شمشیریں
گھوڑوں کی پیٹھ سے چپکی ہوئی رانیں راوی
تھور کے کانٹوں میں اٹکا ہوا تاج شاہی
شہزادوں کے شبستاں میں کھنکتے لمحے
کھڑکی کے پردوں کے پیچھے سے اچھلتے لمحے
شاہراہوں کے اندھیروں میں لڑھکتے لمحے
لمحے بے چہرہ، عدم خواب شکستہ لمحے
موسلادھار برستے لمحے
غار گندم میں سرکتے لمحے
خوف کی پیٹھ ہمکتے لمحے
لمحے بے چہرہ عدم خواب شکستہ لمحے

لہو سبز سیلاب آوا گمن

لہو سبز سیلاب آوا گمن
ظفر جامنی تیرگی تالیاں
کھرچتے ہیں خوابوں کو ناخن نظر
مگر مفلسی

رائگاں رت جگوں میں رطوبت رواں
پاؤں کی چوٹ لنگڑے خیالوں کو گھڑ دوڑ میدان میں
سر برہنہ صعوبت کے سایوں کے پیچھے بھگائے عدد
اشتہاروں میں لپٹی ہوئی صبح سورج کا پھل

بیچنے پر بہ ضد
ننھے پیروں سے لپٹی ہوئی دھوپ جغرافیہ
حاشیہ، ہاتھا پائی میں الجھے ہوئے لفظ میزان گھر
معتدل موت کی دھڑکنیں زیر و بم

رند راقم رقم
کاپخ کی بوتلوں میں سلگتی ہوئی تیلیاں
بدگماں خواہشوں کی رگوں میں سرکتا دھواں
نیم جاں ہڈیاں

زرد زردہ تعاقب کی سرگوشیاں
آتے جاتے پرندوں کی آنکھوں میں بکھرا ہوا آسماں
جامنی ناخنوں سے کھرچنے کی تادیب میں
ڈوبتا ہے ابھرتا ہے سیلاب میں سبز آوا گمن
ڈوبتا ہے ابھرتا ہے آوا گمن

عادل منصوری

بشارت پانی کی

پرانی بات ہے
لیکن یہ انہونی سی لگتی ہے
وہ سب پیاسے تھے
میلوں کی مسافت سے بدن بے حال تھا اُن کا
جہاں بھی جاتے وہ دریاؤں کو سوکھا ہوا پاتے
عجب بنجر زمینوں کا سفر درپیش تھا ان کو
کہیں پانی نہ ملتا تھا
کھجوروں کے درختوں سے انھوں نے اونٹ باندھے

اور تھک کر سو گئے سارے
انھوں نے خواب میں دیکھا
کھجوروں کی قطاریں ختم ہوتی ہیں جہاں
پانی چمکتا ہے
وہ سب جاگے
ہر اک جانب تحیر سے نظر ڈالی
وہ سب اٹھے
مہاریں تھام کر ہاتھوں میں اونٹوں کی
کھجوروں کے درختوں کی قطاریں
ختم ہونے میں نہ آتی تھیں
زبانیں سوکھ کر کانٹا ہوئی تھیں
اور اونٹوں کے قدم آگے نہ اٹھتے تھے
وہ سب چیخے
بشارت دینے والے کو صدا دی
اور زمیں کو پیر سے رگڑا
ہر اک جانب تحیر سے نظر ڈالی
کھجوروں کے درختوں کی قطاریں ختم تھیں
پانی چمکتا تھا!

پرند سے لوٹ آئے

پرانی بات ہے
لیکن یہ انہونی سی لگتی ہے

ہوا اک بار یوں
بستی کے باغوں میں
کسی بھی پیڑ کی ٹہنی پہ کوئی پھل نہیں آیا
ہرے پتوں کا موسم لوٹ کر واپس نہیں آیا
پرندے رو دیے
اور دور کے باغوں میں ہجرت کر گئے سارے
بہت آزردہ ہو کر باغبانوں نے
دعائیں کی
مناجاتیں پڑھیں
اپنے گناہوں کی
خدائے لم یزل سے معافیاں مانگیں
درختوں کی جڑوں کو ڈھیر سا پانی دیا
اور کیاریاں کاٹیں
ہرے پتوں کا موسم لوٹ کر واپس نہیں آیا
پرندے لوٹ آئے تھے
نئی بستی کے باغوں سے
ہرے پتوں کی ٹہنی توڑ لائے تھے

زبیر رضوی

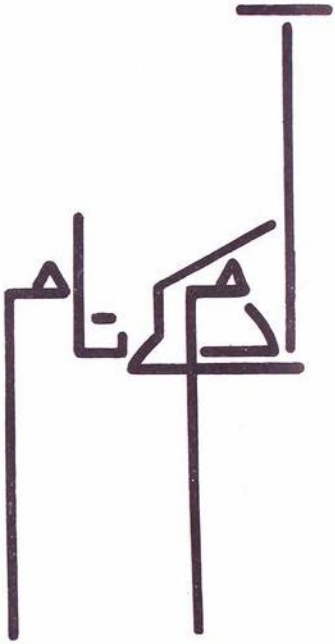

نئی ڈائری کا پہلا ورق

صرف کاغذ کے کلنڈر میں نیا دن بدلا
صرف لوہے میں بند ہے وقت کا ڈائل گھوما
چابیوں والا کھلونا

چپ چاپ
گھر کی دہلیز سے باہر آکر
دائرہ دائرہ ــ ناچا گھوما
تالیاں بجتی رہیں
قہقہے سجتے رہے

ــــــ چوکڑیاں بھرتا ہوا دھوپ ہرن،
آخری بس کے سیہ پہیے سے
ہانپتا کانپتا ٹکرایا، گرا، ٹوٹ گیا
ایک دن اور کئی دن کی طرح روٹھ گیا

آج بھی وہ ہی ہوا،
جس کے ہونے کا بہت خدشہ تھا
آج بھی کچھ نہ ہوا،

ندا فاضلی

اظہار میں بھی ہوں

خاموشیوں کے دشت کا اظہار میں بھی ہوں
سونے مکاں میں نقش بہ دیوار میں بھی ہوں

ظلمت میں میری نور کوئی ڈھونڈتا پھرے
جیسے خود اپنی ذات کا اک غار میں بھی ہوں

مجھ میں بھی حادثات کی تفصیل درج ہے
اپنے تغیرات کا اخبار میں بھی ہوں

خوابوں میں، میں نے بارہا پکڑی ہیں تتلیاں
رنگوں کی آرزو کا گنہگار میں بھی ہوں

شاید مرا حریف ہی مجھ کو خریدلے
سودے میں اپنے یوں تو خریدار میں بھی ہوں

تو کر رہا ہے خانۂ فرعون کا طواف
جادوئے سامری میں گرفتار میں بھی ہوں

سلیم شہزاد

اپریل

تاب سے چھوٹا
نظمیں
دم واپسیں
بلغ یہ اچھا کرتی ہے
گھوڑا گھانس ہی کھاتا ہے
کتا بھونک رہا ہے
مرغے کیوں لڑتے ہیں
بکری کو دیکھا ہے

تاب سے چھوٹا

ہزاروں کش مکش و پیچ و تاب سے چھوٹا
جو اپنے آپ سے چھوٹا، عذاب سے چھوٹا

مرے وجود پہ مرکوز ہے نظر سب کی
مطالعے کا نہ رشتہ کتاب سے چھوٹا

جسے خلاصۂ مقصود و ماجرا کہیے
سوال کا وہی پہلو جواب سے چھوٹا

ہمیں تو یاد نہیں اس کے گھر کا رستہ بھی
وہ حیلہ، ہم نفسان شباب سے چھوٹا

روش روش ہے وہی قتل گاہ کا موسم
لہو کا رنگ نہ کشت و گلاب سے چھوٹا

شکستنی سہی یہ آئینہ، مگر پھر بھی
حقیقتوں کا تعلق نہ خواب سے چھوٹا

یہ چہرہ چہرہ اداسی کا سایہ کیسا ہے
وہ روشنی کا نگر آفتاب سے چھوٹا

بہت عمیق تھے گو اس کے جسم کے اسرار
نہ کوئی گوشہ مرے اکتساب سے چھوٹا

تری تلاش نے صحرائے جاں میں روک لیا
میں جسم جسم بکھرتے سراب سے چھوٹا

فضا نصیب ہے اپنا سفر مدام سفر،
کبھی نہ پاؤں جنوں کی رکاب سے چھوٹا

فضا ابن فیضی

نظمیں

۱

جب
جنگل کی چھوٹی چھوٹی
کچی کچی جھونپڑیوں سے
ناتراشیدہ، نیم برہنہ
جوان لڑکیاں
سال کے پیڑ جیسی سیدھی
اپنے سینے کے سڈول بوجھ
اور چونکنی آنکھوں کے ساتھ
شہر کے بازار
مہوے لے کر آتی ہیں
تو بوڑھی زمین
کی چھاتیوں میں دودھ اتر آتا ہے

۲

کبھی کبھی
سب کچھ
بے شکل، بے رنگ اور بعید
دکھائی دیتا ہے
دل گھبرانے لگتا ہے

کبھی کبھی
پرندے پھول اور پتھر
ہم نفس معلوم ہوتے ہیں
دل پہلو میں ٹھہر جاتا ہے
کبھی کبھی
جی چاہتا ہے کہ
پتھروں کے پاؤں میں کچھ
پہنا دو
کیونکہ جب وہ پہاڑ سے اترتے ہیں
تو اس کے پاؤں زخمی ہو جاتے ہیں

۳

اسے لوگوں پر غصہ آیا
اور اس نے کہا
میں داؤد کا
بیٹا ہوں
اور جب لوگوں
نے اُسے داؤد
کا شجرہ دکھایا تو اُسے
لوگوں پر اور غصہ آیا
اور اس نے کہا
میں خدا کا بیٹا ہوں
لوگوں نے اسے صلیب پر چڑھا دیا
اور پھر سب سجدے میں گر پڑے

اور ایک زبان ہو کر بولے
تو خدا تھا
تو خدا ہے

۴

جب کوسوں
پانی
کی ایک بوند دکھائی
نہیں دیتی تو میں
اس خیال سے
خوش ہو لیتا ہوں کہ دریا میرا
میزبان ہے

۵

سورج ایک تصویر ہے
جو چیخ پڑتی ہے
چاند نیند کی جھیل ہے
رات آنکھوں کا بن ہے
شام جنگل کے دل کی ہوک ہے
دوپہر چھاتیوں کا سنگیت ہے
اور صبح ایک بے کنار بوسہ ہے

دم واپسیں

یہ خوش وقتیوں کی گھڑی ہے
طواف غم ذات سے باز آؤ
مرے داغ کے دائرے پر
اک الاؤ
دم واپسیں خود جلاؤ
آتشیں رقص سے اس کے
اپنی کسی شام کی سرد بے کیفیوں میں
ڈرامہ کا عنصر جگاؤ
کسی یونانی المیہ کا عکس دیکھو
کسی کردار کے دل میں اترو
مگر لوٹ آؤ
کسی بے خانماں کش مکش کو
ازل سے ابد تک ملاؤ
کسی ایک ایکٹ پر
قبل از اختتام
زرد پھولوں کا پردہ گراؤ
مرے داغ کے آتشیں عکس سے
سرمئی شام کو
روئے رنگیں بناؤ

ساجدہ زیدی

بلی یہ اچھا کرتی ہے

صبح سویرے آنگن میں
لڑتی چڑیوں کی جانب
اک بلی پنجوں کے بل
دھیرے دھیرے سرک رہی ہے!
بلی لپکی
اور اک چڑیا کو پنجوں میں داب لیا!!
کل پھر بلی آئے گی
چڑیاں پھر لڑتی ہوں گی
اور میں دیکھ رہا ہوں گا!!
چڑیاں کیوں لڑتی ہیں
بلی یہ اچھا کرتی ہے
میں یہ سب کیوں دیکھ رہا ہوں
یہ سب میں کیوں سوچوں!!

گھوڑا گھانس ہی کھاتا ہے

گھوڑا شہر کی سڑکوں پر اب آتے ہوئے گھبراتا ہے
شہر سے دور کسی قصبے میں کھڑک کھڑک جاتا ہے

رکشا پٹرول پیتا ہے اور دن بھر شور مچاتا ہے
گھوڑا "میرا باپ کہاں ہے" جگہ جگہ چلاتا ہے
گھوڑا تو قصبہ کی جانب کھڑک کھڑک جاتا ہے
گھوڑا کو معلوم نہیں ہے شہر بھی پیچھے آتا ہے
گھوڑا گھانس ہی کھاتا ہے!!

کتا بھونک رہا ہے

کتا بھونک رہا ہے
اندر کوئی نہیں ہے
باہر کوئی کھڑا ہے
کتا بھونک رہا ہے
کتے کو معلوم نہیں ہے
باہر صرف ہوا ہے
اندر کوئی چھپا ہے
کتے کے اندر کا کتا
سب کچھ جان گیا ہے
کتا بھونک رہا ہے
کتا اونگھ رہا ہے

مرغے کیوں لڑتے ہیں

گردن کے پر اونچے کرکے
لمبی لمبی گردن کرکے

قَالَ يٰآدَمُ اَنْبِئْهُمْ بِاَسْمَآءِ هِمْ فَلَمَّآ اَنْبَاَهُمْ بِاَسْمَآءِ
هِمْ لا قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضِ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ۔
البقرۃ ۲

"حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اے آدم ان کو ان چیزوں کے اسماء بتلا دو، سب بتلا دیئے ان کو جب آدم نے ان چیزوں کے اسماء۔ تو حق تعالیٰ نے فرمایا (دیکھو) میں تم سے کہتا نہ تھا کہ بے شک میں جانتا ہوں تمام پوشیدہ چیزیں آسمانوں اور زمین کی جس بات کو تم ظاہر کر دیتے ہو اور جس بات کو دل میں رکھتے ہو۔"

دو مرغے لڑتے ہیں
دو مرغے تندوری مرغے
ایسا کیوں کرتے ہیں
آؤ چلو اس ہوٹل سے
ہم اور کہیں چلتے ہیں
اس ہوٹل میں بھی کھانے کے
دام بہت پڑتے ہیں
مرغے کیوں لڑتے ہیں

بکری کو دیکھا ہے

چارا کھاتی جگالی کرتی بکری کو دیکھا ہے
دودھ پلاتی پانی پیتی بکری کو دیکھا ہے
گلی گلی میں گھر گھر پھرتی بکری کو دیکھا ہے
بیں بیں کر کے بچے جنتی بکری کو دیکھا ہے
دو پیر اونچے کر کے لڑتی بکری کو دیکھا ہے
کیا بتلائیں کیا کیا کرتی بکری کو دیکھا ہے
بازاروں میں چوک میں بکتی بکری کو دیکھا ہے
ڈرتے ڈرتے ہم نے کٹتی بکری کو دیکھا ہے
تم نے تو بس گاندھی جی کی بکری کو دیکھا ہے

محمد علوی

مئی

ستمبر آ
نئی نسل کے لیے ایک نظم
ضرور تھا
احساس

ستمبر آ

صد فردوس محبت زار ستمبر آ
اے رنگوں کے موسم، منظر منظر آ
آدھے ادھورے لمس نہ میرے ہاتھ پہ رکھ
کبھی سپرد بدن سا مجھے میسّر آ
کب تک پھیلائے گا دھند مرے خوں میں
جھوٹی سچی نوا میں ڈھل کر لب پر آ
بادل دے آکاش کو، فصل زمیں کو دے
بادِ امکاں، حشر بشارت بن کر آ
مجھے پتہ تھا، اک دن لوٹ کے آئے گا تو
کیوں دہلیز پہ رک سا گیا ہے: اندر آ
اے پیہم پرواز پرندے، دم لے لے
نہیں اترتا آنگن میں تو چھت پر آ
اس نے عجب کچھ پیار سے اب کے لکھا بانی
بہت دنوں پھر گھوم لیا: واپس گھر آ

نئی نسل کے لئے ایک نظم

اک نکڑ پر
نیلی، پیلی، سبز نلکیاں
صابن کے پانی سے
ننھے صاف بلبلے بنا رہی ہیں
یہ منظر کتنا اچھا ہے
اس نکڑ کی سمت ہی رخ ہے تیز ہوا کا
آؤ، جلدی اونچی سی دیوار بنائیں
روک لیں ہم سب تیز ہوا کو
اس نکڑ پر
نیلی، پیلی، سبز نلکیاں، صابن کے پانی سے
ننھے صاف بلبلے اور بنائیں

شہریار

ضرور تھا

پتھر کا میری سمت تو آنا ضرور تھا
میں ہی گناہ گاروں میں اک بے قصور تھا

سچائی آگ ٹھہری تو لب جل کے رہ گئے
حق گوئی پہ ہمیں کبھی کیا غرور تھا

شبنم پہن کے نکلے تھے شعلوں کے قافلہ
دیکھے تہہ لباس یہ کس کو شعور تھا

بیٹھا ہوا تھا کوئی سر راہ آرزو
اک عمر کی تھکن سے بدن چور چور تھا

ٹھہرا ہوا ہے ایک ہی منظر نگاہ میں
اک نیم وا دریچہ تھا سیلاب نور تھا

بن کر زبان بول رہا تھا بدن تمام
"سمجھے نہ ہم تو فہم کا اپنی قصور تھا"

دیکھا قریب سے تو وہ موج سراب تھی
جس آب جو کا چرچا بشر دور دور تھا

بشر نواز

احساس

دور تک خود اپنی سانس
دور تک سانسوں کی باس
دور تک ہے ٹوٹ کر بکھری ہوئی
اک سہانی چھاؤں پا جانے کی آس
دور تک ہے دوپہر
جلتی ہوئی
اک پرندے کی طرح اڑتا ہوا
بے ارادہ، بے سبب
گاہے ادھر گاہے ادھر مڑتا ہوا
ہیں خود اپنی سانس ہی کی چلچلاتی دھوپ میں
سرگرم کار
سینہ فگار
جیب و دامن تار تار
جا بجا بنتے بگڑتے سے نقوش
ذہن میں مٹتا ابھرتا اک خیال
دور تک ہے بے یقینی اور مایوسی کا جال
اور میں
زخمی پرندے کی طرح ٹکرا رہا ہوں دیر سے
گاہے ادھر گاہے ادھر
دور تک ہے دوپہر

نازش پرتاب گڈھی

جون

ذرا چل
تم
مٹی کا گیت
رستگاری
سفر کی دعا
پتہ نہیں وہ کون تھا
دسمبر جا
سمندر اور میں
سوچتا نہ تھا
نشہ ہوں میں کبھی
تھا تھا سا تھا
سیاروں کے بیچ
ماہتاب مانگے ہے

ذرا چل

جو گھر بھی ہے، ہم صورتِ مقتل ہے، ذرا چل
کھٹکائیں شہیدوں کے دریچوں کو، ہوا چل

نکلی بھی اگر دھوپ تو کجلائی سی ہوگی
بدلی ہی میں، بھیگے ہوئے دامن کو سکھا چل

ناخواندگیاں لٹیں گی تاریخ کے اوراق
نام اپنا کسی صفحۂ سادہ پہ لکھا چل

سوئی ہوئی لگتی ہیں سبھی جاگتی آنکھیں
اوڑھے ہوئے تو بھی کوئی خوابوں کی ردا چل

جذبوں کے در و بام پہ طاری ہے خموشی
ناداریٔ احساس کی زنجیر ہلا چل

اعجاز صدیقی

THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM

LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.

جنوری
فروری
مارچ
اپریل
مئی
جون
جولائی
اگست
ستمبر
اکتوبر
نومبر
دسمبر

تم

۱

کہاں سے آئی ہو، کون ہو تم
نہ گل، نہ خوش بو
مگر تمہارا وجود خود رخ گلستاں ہے
وہ کائنات سرور جس کا
خود اپنا سورج ہے، چاند اپنا
میں کائنات سرور میں سانس لے رہا ہوں
شکنتلا ہے یہاں، نہ ہیلن
نہ ہیر ہے اور نہ جولیٹ ہے
فقط تمہارے بدن کا موسم
جو میری نظروں کی نرم بارش میں
رنگ اور نور بن گیا ہے

کوئی نہیں تم سے بڑھ کے دنیائے دلبری میں
کوئی نہیں مجھ سے بڑھ کے دنیائے عاشقی میں
ہر ایک سے تم حسین تر ہو
ہر ایک سے تم قدیم تر ہو
ہر ایک سے تم عظیم تر ہو

۲

تمہارے ہونٹوں کے خم میں جو لفظ بن رہے ہیں
وہ میرے سینے میں پھول کی طرح کھل رہے ہیں
تمہاری "ہاں" اک گلاب ہے تازہ و شگفتہ
کہ جس سے ایوان جاں معطر
"نہیں" بھی ننھی سی اک کلی ہے
جو دل کی نازک سی شاخ میں سو رہی ہے
خواب بہار بن کر
یہ خواب تعبیر کے گلستاں کا منتظر ہے
تمہارے دل کش بدن کے رنگوں میں مضطرب ہے
مجھے "نہیں" کی کلی عطا ہو
کہ جس سے "ہاں" کا گلاب مہکے

۳

سرور شام خیال ہو تم
جمال صبح وصال ہو تم
تمہارا جسم اک چمکتا شعلہ ہے
جیسے آتش کہ کوئی لو ہو
تمہارے آنچل کے آفتابوں کی روشنی ہے
جو اس طرح چھن رہی ہے جیسے

نئی سحر کی جوان خو ہو

نئی سحر جس کی آرزو میں ہزار شامیں گذر چکی ہیں

۴

تمہارے شہرِ جمال میں
میرے دل کا کاسہ
بھٹک رہا ہے
تم اپنے ہونٹوں کا شہد
آنکھوں کے پھول
ہاتھوں کے چاند دے دو
یہ مفلسی کی سیاہ راتیں وجود پر طنز کر رہی ہیں

۵

ہوائیں جو میری راز داں ہیں
وہ میرے ہونٹوں سے لفظ لے کر
تمہارے کانوں کی سیپیوں میں
گہر کے مانند ڈالتی ہیں
میں مسکراتا ہوں
تم بھی ہنستی ہو
اور دونوں
نئی تمناؤں کے جزیرے میں گھومتے ہیں
نہ کوئی محکوم ہے، نہ حاکم
نہ کوئی قانون ہے، نہ سختی
بس ایک زنجیرِ زلف، شمشیرِ دل ربائی

سردار جعفری

مِٹی کا گیت

مٹی کے سب رنگ انوکھے، سب دیوانے مٹی کے
مٹی کے سب کھیل کھلاڑی، مٹے پرانے مٹی کے

مٹی کی یہ سندر کایا، مٹی کی ہی ساری مایا
کنکر پتھر، سونا چاندی، سولہ آنے مٹی کے
مٹی کے سب چہرے مہرے، مٹی کے سب ننگے پاؤں
مٹی کی یہ زلف گھنیری، سب کے ٹانے مٹی کے
مٹی کی یہ ننھی سی کیاری، مٹی کی مہکی پھلواری
مٹی کے یہ پھول یہ کلیاں، سب کے دہانے مٹی کے

مٹی کے سب کھیت ہمارے، مٹی کی پگڈنڈی بھی
مٹی کے ہریالے پودے، دانے دانے مٹی کے
مٹی کے سب پنگھٹ اپنے، مٹی کی سی سب سکھیاں
مٹی کے چمکیلے گگرے، کون یہ جانے مٹی کے
مٹی کی ماں بہنیں اپنی، مٹی کے ہیں سب رسیا
جھولا جھولیں سب مٹی کا، سب کے ترانے مٹی کے
مٹی کی سی موہنی صورت، مٹی کی یہ اپنی گڑیا
مٹی کے سب دلہن دولھا، تانے بانے مٹی کے
مٹی کے سب دادا دادی، مٹی کے سب نانی تانا
مٹی کے سب آنکھوں والے، اندھے کانے مٹی کے
مٹی کے سب محل دو محلے، مٹی کی چھوٹی سی کٹیا
مٹی کے سب دیئے، یہ شمعیں، سب پروانے مٹی کے
مٹی کی سب گلیاں اپنی، مٹی کے سب گاؤں ہمارے
مٹی کے سب شہر سے ہیں، سب ویرانے مٹی کے
مٹی کے سب ساقی دل بر، مٹی کے سب شیشہ و ساغر
مٹی کے سب جام و سبو ہیں، سب پیمانے مٹی کے
مٹی کے سب دیوتا دیوی، مٹی کے سب گرجا مسجد
کیا سیتا، کیا کالی ماتا، سب افسانے مٹی کے
مٹی کی بیٹھی سی بنسی، مٹی کی سی چنچل رادھا
مٹی کے سے کرشن کنہیا، سب کے گانے مٹی کے

مٹی کا بازار لگا ہے، کورے کورے سے۔ برتن
کس کی صراحی، کس کا پیالہ، سب پیمانے مٹی کے
مٹی کے چولھے پر ناچے سوندھی روٹی مٹی کی،
چوکا چکی، چاک میں پیسے دانے دانے مٹی کے
مٹی کی خوش بو میں بسا ہے، مٹی کا یہ ذرہ ذرہ
مٹی کو مٹی ہی پکارے، چیلے بہانے مٹی کے
جھن جھن، جھن جھن، جھن جھن، بجتی کوری مٹی کی
کھن کھن، کھن کھن، گیت سناتے آنے آنے بھٹی کے
تاک دھنا دھن، تاک دھنا دھن بولے طبلہ مٹی کا
ناچو، ناچو، ناچو، ناچو سب رقصانے مٹی کے
دھما دھما دَھو، دھما دھما دَھو، دھمکا مٹی کا تانڈو
اس کے پیچھے یا ہُو، یا ہُو، سب مستانے مٹی کے
دھڑ دھڑ دھڑ دھڑ دھڑ دھڑک رہی ہے ہر چھاتی مٹی کی
سرسر، سرسر، سرک رہے ہیں، سارے شانے مٹی کے
مٹی مٹی مٹی باجے۔ باجے کوچ کا نقارہ
گھر چل، گھر چل، گھر چل گھر چل، او من مانے مٹی کے
مٹی مٹی مٹی، مٹی لوری گاتی ہے تو
سو جا، سو جا، سو جا او دیوانے مٹی کے
مٹی کی چادر میں چھپیں گے۔ قبر بنے گی مٹی کی
سب مٹی میں مل جائیں گے، ختم فسانے مٹی کے
ختم فسانے مٹی کے

خلیل الرحمٰن اعظمی

رستگاری

۱

زخم پھر ہرے ہوئے
پھر لہو تڑپ تڑپ اُٹھا
اندھے راستوں پہ بے تکان اُڑان کے لئے
بند آنکھ کی بہشت میں
سب دریچے ـــــ سب کواڑ کھُل گئے
اور پھر
اپنی خلق کی ہوئی بسیط کائنات میں
دُھند بن کے پھیلتا سمٹتا جا رہا ہوں میں
خدائے لم یزل کے سانس کی طرح
میرے آگے آگے اک ہجوم ہے
جس کو جو بھی نام دے دیا ـــــ وہ ہو گیا
میرے واسطے سے سب کے سلسلے بندھے ہوئے ہیں
ـــــ سب کی موت، زندگی
میرے واسطے سے ہے
زمیں و آسماں کے بیچ
جس کو بھی پناہ نہ مل سکے
وہ آئے میرے ساتھ ساتھ
منتظر ہے آج بھی

فضا جو لفظ لفظ پر محیط ہے
عمیق اور بسیط ہے

۲

مجھے بھی آج تک نہ مل سکا
تماشا گاہ روز و شب کا بیچ
——— اپنے طور پر
نئے سرے سے جس کو بو سکوں
کہاں کے سلسلے
——— کیسے واسطے
رگوں میں صرف اس قدر لہو بچا ہے
——— پنکھو پنکھ ہیں
کچھ ہوا سمیٹ کر
آخری اُڑان بھر سکوں
بے محابہ سوچ
——— آندھیوں سی سوچ ہیں
صرف ہو رہا ہوں میں
ہر تھپیڑا مرے نقش چاٹ چاٹ کر
دھند بن رہا ہے
——— دھند گہری ہو رہی ہے
گزرتے وقت سے میں جُڑ رہا ہوں
——— جُڑ گیا ہوں
——— اپنا کام کر چکا

قاضی سلیم

سفر کی دعا

میں یہاں قید ہوں
میری دامادگی نے مرے پانوں میں ایک زنجیر ڈالی ہے
ماحول نے میری زنجیر میں اور کڑیاں بڑھائیں
رشتۂ روح و جاں آج تک قفل زنجیر پا
فکر نان جویں پر کترتی ہے پرواز کے
پا پیادہ نہ طے ہو سکیں گے کبھی، فاصلے، دور سے آتی آواز کے
اک جزیرے میں محصور ہیں حوصلے سب تگ و تاز کے ــــ
مجھ سے چل کر مجھی تک پلٹ آتے ہیں سائے میری ہی آواز کے

پائے وحشت نہیں لنگ
(جیسا جزیرہ پرستوں کا)

بزمِ امکاں نہیں تنگ
(جس طرح اندھی انا کے جزیروں کی ہے)
کرۂ ارض تو ایک سیارہ ہے
نیم روشن خلا میں معلق
نوکِ سوزن پہ اک قطرۂ خوں گرفتہ
کیا مرے شوق کے پاؤں اس نوکِ سوزن سے بھی ہیں حقیر؟
کیا مری جرأتِ آرزو، نیم روشن کرے سے بھی کم؟
نیلے، اودے، ہرے، گہرے مٹیالے، کالے چمکتے ہوئے پانیوں کے سمندر
ہیں میری نگاہوں کے بھی منتظر
سخت اور نرم، خشک اور نم، اونچی نیچی زمینوں کے زینے
کہیں سبز پوش اور کہیں گل بدن
کہیں صرف بے رنگ گرد و غبار
اور کہیں ساتوں رنگوں کی آمیزشوں کے مصور ورق
یہ تنوع کے منظر بھی میری نگاہوں کے ہیں منتظر
میرے قدموں، مرے لمس اور میرے بوسوں کے ہیں منتظر
قریہ در قریہ، کوچہ بہ کوچہ چمکتے ہوئے چشم و لب
کارواں کارواں شاہراہوں پہ چلتے ہوئے زندہ شاداب روشن بدن
تنگ سیلے، سیہ قبر آسا مکانوں میں بیٹھے ہوئے سرنگوں رنج و درد و تعب
ظلم کے آتشیں خون آلودہ ایوانوں میں حکمراں جبر و قہر و غضب
میرے چشم و لب و دست و پا کے بھی ہیں منتظر
حوصلے زیست کرنے کے میری دعا کے بھی ہیں منتظر

سردار جعفری

اختر الایمان

شمس الرحمٰن فاروقی

شاذ تمکنت

عشق کے مکتب اور علم کے مدرسے
مقتل اور میکدے
جہد کے قافلے
شوق کے سلسلے
ہوں جہاں بھی

مرے ذہن و دل کی ضیاؤں کے ہیں منتظر
نطق و حرف و صدا کے ہیں جتنے بھی رنگ
آرزو کی امنگ
زندگی کی ترنگ
عیش اور غم کے ڈھنگ
میرے لفظ و معانی کی رقصاں شعاعوں کے ہیں منتظر

یہ زمیں اپنی وسعت تلک
آسماں اپنی رفعت تلک
دے رہے ہیں صدا

پانیوں کے سمندر
زمینوں کے منظر
مرے منتظر ہیں

میں یہاں قید ہوں
اے خدا! اس جزیرے کے محصور پانی میں بھی در کھلیں
ساحل آغشتہ کشتی کے لنگر کھلیں
میری زنجیر میں پر کھلیں

وحید اختر

پتہ نہیں وہ کون تھا

پتا نہیں وہ کون تھا جو میرے ہاتھ
موتیے کی ڈال، پنکھ مور کا تھما کے چل دیا
پتا نہیں وہ کون تھا
ہوا کے جھونکے کی طرح جو آیا اور گزر گیا
نظر کو رنگ، دل کو نکہتوں کے دکھ سے بھر گیا
میں کون ہوں؟ گزرنے والا کون تھا؟
یہ پھول پنکھ کیا ہیں، کیوں ملے؟
یہ سوچتے ہی سوچتے، تمام رنگ، ایک رنگ میں اتر گئے
سیاہ رنگ
تمام نکہتیں ادھر ادھر بکھر گئیں خلاؤں میں
یقین ہے..... نہیں نہیں گمان ہے
وہ کوئی میرا دشمن قدیم تھا
دکھا کے جو سراب میری پیاس اور بڑھا گیا
میں بے حساب آرزوؤں کا شکار
انتہائے شوق میں فریب اس کا کھا گیا
گمان ہے..... نہیں نہیں یقین ہے
وہ کوئی میرا دوست تھا جو دو گھڑی کے واسطے ہی کیوں نہ ہو
نظر کو رنگ، دل کو نکہتوں سے بھر گیا
پتا نہیں کدھر گیا
میں اس کو ڈھونڈتا ہوا تمام کائنات میں ادھر ادھر بکھر گیا

بشر نواز

دسمبر جا

دسمبر جا
اکیلا چھوڑ دے مجھ کو
نہ صبحیں دھوپ والی دے، نہ شامیں رنگ والی دے
مرے شہر خموشاں کو فقط راتیں تو کالی دے
تو اپنے ساتھ یہ نیندوں بھری ٹھنڈی ہوا لے جا
یہ موسم، یہ مناظر اور یہ پُرفسوں فضا لے جا

دسمبر جا
نہ رونے کی اجازت ہے، نہ ہنسنے کی تمنّا ہے
مرے اندر، مرے باہر
یہ کیسا سخت پہرا ہے
مرے نزدیک یہ بڑھتا اندھیرا کتنا گہرا ہے

دسمبر آ
مقدس آسمانوں سے اترتی سانولی سی شام، یہ جام و سبو لے جا
مری نس نس میں ہونے سے جواب بھی سرسراتا ہے لہو لے جا
دسمبر آ
دسمبر جا

کمار پاشی

سمندر اور میں -!

میں کالی ریت کا ساحل سہی
کوئی تو ڈوبتے شب کے جزیرے سے
ابھر کر، روشنی کے بادباں کھولے
ستاروں کو بھنور کا ساز دے
کوئی تو آخرِ شب کو ذرا آواز دے
افق سے تا افق، لیکن بڑی گہری اداسی ہے
نہ کوئی نور کی مشعل، نہ کوئی گیت ماجھی کا
نہ کوئی گنگناتی سرپھری کشتی گھٹاؤں کی
رباب شش جہت کیوں دل شکستہ ہے؟
لباس گردشِ عالم بھی خستہ ہے
سمندر چیختا تھا میرے سینے میں کبھی لیکن
میں اب تو ریت کا تشنہ بہ لب سنسان ساحل ہوں
وہ ننگا اژدھا لیٹا ہوا ہے میرے سینے پر
کہ جس کو دوسرے لفظوں میں سناٹا بھی کہتے ہیں
نہ جانے کیوں؟ سمندر میں کوئی طوفاں نہیں اٹھتا
مگر کچھ دور سونے مقبروں کے بے ثمر اونچے درختوں سے
اڑے ہیں اس طرح دو پھڑپھڑاتے کانپتے زخمی حسیں طائر
کہ جن کی دل شکن اور روح فرسا چیخ کو سن کر اچانک شب کا سایہ ڈر گیا ہے
زمیں تو زندہ ہے اب تک، ہوا بھی سربرہنہ ہے
مگر روتا ہوا بوڑھا سمندر مر گیا ہے

پریم وار برٹنی

سوجھتا نہ تھا

پھیلی ہوئی تھی دشت بدن میں ہوس کی دھوپ
خود سے پرے نگاہ کو کچھ سوجھتا نہ تھا

اک رات میں یہ پیڑ ہوا کیسے بے لباس
کل تک تو اس کا ایک بھی پتہ جھڑا نہ تھا

یوں تیرے بعد اجنبی لگتے ہیں بام و در
جیسے میں اپنے گھر سے کبھی آشنا نہ تھا

کاٹا گیا نہ قربت پیہم کے باوجود
وہ فاصلہ، جو دیکھنے میں فاصلہ نہ تھا

آنے لگی ہے سایۂ دیوار سے بھی آنچ
اس درجہ گرم تو کبھی سورج ہوا نہ تھا

ہر راہ گیر اپنی لگن میں تھا گرم رو،
جانا ہے کس طرف یہ کسی کو پتا نہ تھا

اس بے لحاظ شہر میں سب خود پرست تھے
دکھ درد دوسروں کے کوئی بانٹتا نہ تھا

نوبہار صابر

نشہ ہوں میں بھی

جانے کس خواب کا سیال نشہ ہوں میں بھی
اجلے موسم کی طرح ایک فضا ہوں میں بھی

راہ پامال تھی، چھوڑ آیا ہوں ساتھی سوتے
کوری مٹی کا گنہ گار ہوا ہوں میں بھی

کتنا سرکش تھا، ہواؤں نے سزا دی کیسی
کاٹھ کا مرغ ہوں اب، بادنما ہوں میں بھی

کیسی بستی ہے! مکیں جس کے ہیں بچے بوڑھے
کیا مقدر تھا! کہاں آکے رکا ہوں میں بھی

ایک بے چہرہ سی مخلوق ہے، چاروں جانب
آئینو! دیکھو مجھے، مسخ ہوا ہوں میں بھی

ہاتھ شمشیر پہ ہے، ذہن پس و پیش میں ہے
راز کن یاروں کے مابین کھڑا ہوں میں بھی

راج نرائن راز

تھما تھما سا تھا

ترے خیال کا شعلہ تھما تھما سا تھا
تمام شہر تمنا بجھا بجھا سا تھا
نہ جانے موسم تلوار کس طرح گزرا
مرے لہو کا شجر تو جھکا جھکا سا تھا
ہمیں بھی نیند نے تھپکی دی سو گئے تم بھی
تمام رات شبِ شب سنا سنا سا تھا
کہاں سے وقت کی سانسوں کے بادباں کھلتے
ہوا کا قافلہ کب سے رکا رکا سا تھا
وہ نام جس کے لئے زندگی گنوائی گئی
نہ جانے کیا تھا مگر کچھ بھلا بھلا سا تھا
امام ہم سفر دوستان عالی مقام
چراغ ختم سفر تھا، تھکا تھکا سا تھا

مظہر امام

سیاروں کے بیچ

کرۂ خاکی ہوں سیاروں کے بیچ
آئینہ سا آئینہ داروں کے بیچ
بازگشتو! راستے مسدود ہیں
ایک گنبد چار میناروں کے بیچ
آسرا دیتے ہیں خوش فہمی کے ساتھ
پھول کھلتے آئے ہیں خاروں کے بیچ
وسعتوں کی بے کرانی دیکھ کر
راہ طے کرتا ہوں دیواروں کے بیچ
مطمئن ہوں دشمنوں کے بیچ میں
تم کشاکش میں مددگاروں کے بیچ
ان مسائل سے کہاں دو چار تھے
جب رہا کرتے تھے ہم غاروں کے بیچ
اے مظفر بزم میں تیری غزل
جیسے کوئی نرس بیماروں کے بیچ

مظفر حنفی

ماہتاب مانگے ہے

گلاب مانگے ہے نے ماہتاب مانگے ہے
شعور فن تو لہو کی شراب مانگے ہے
ہوس کی باڑھ ہر اک باندھ توڑنا چاہے
نظر کا حسن مگر انتخاب مانگے ہے
کہاں ہو کھوئے ہوئے لمحو! لوٹ کر آؤ
حیات عمر گزشتہ کا باب مانگے ہے
چڑھا رہا ہے صلیبوں پہ ہم کو صدیوں سے
زمانہ پھر بھی مقدس کتاب مانگے ہے
نہ جانے کتنی گھٹائیں ملی ہیں راہوں میں
مگر ہے پیاس کہ ہر دم سراب مانگے ہے
ہے زنگ خوردہ مرے دل کا آئینہ ایسا
خرد کی تیغ سے تھوڑی سی آب مانگے ہے
بکھر گیا تھا جو کل رات کرچیوں کی طرح
مری نگاہ وہ ٹوٹا سا خواب مانگے ہے

کرامت علی کرامت

جولائی

رباعیات
برف باری
وہ حرف وصوت، وہ صدا
بکھر جاؤں گا میں
میزان میں رکھ
جائے کہاں کہاں
لاٹ کے جنگل میں پھنسی نسل
لب کچھ بھی نہیں
ایک منظر
غزلیں

پریم واربرٹنی

بشیر بدر

نوبھار صابر

بلراج کومل

رباعیات

ہر اونچی پہاڑی پہ افق کا ہے گماں
ٹھہراؤ ہے یا وقت بنا ہے زنداں
نیلے کہرے کے بازوؤں میں میداں
چپ چاپ پر اسرار سا لیٹا ہے یہاں

سر میں ہے نہاں طاقت جتنی ہے ابھی
پے چیدہ دھواں ہیں شان اتنی ہے ابھی
رہ رہ کے یہ پوچھتی ہے ثابت قدمی
پس پا ہونے میں دیر کتنی ہے ابھی

لمبی ڈھلوان گلی ، اترنا ہے مجھے
کٹتے ہی سر صبح گزرنا ہے مجھے
ٹھنڈا پانی رگ رگ بھرنا ہے مجھے
جتنا چاہوں ۔ جی لوں مرنا ہے مجھے

تجھ سا نہیں دنیا میں کوئی تنہا آ
امڈا ہے چار سمت کا دریا آ
یہ تیرہ شبی گنجان اتنی کب تھی
مٹنے کو ہے تیری آواز پا آ

جنگل تھرا اٹھا ہے سویا تھا ابھی
سنسان ہوا سے کوئی بولا تھا ابھی
ساکت گمبھیر فرش شب کے اوپر
لمبے قدموں سے کون گزرا تھا ابھی

سویا ہے بدن کیوں ہوس آثار ترا
نیلم سا چمکتا ہے دیدار ترا
دوری کی روشنی میں گم کردۂ راہ
آ دیکھ جا میں ہوں، میں ہوں دل دار ترا

دل کے دریا میں پانی۔ ذکر کروں
تو خود ہی اپنا ثانی۔ ذکر کروں
روشن رہ فرداست ز نقش دیروز
ہر چار طرف حیرانی۔ ذکر کروں

پستی بھی ہے اک طرح بلندی کی حد
فانی کو پکارتی ہے آواز ابد
ممکن ہے سنے برگ بھی حرف طوفاں
صد ہا ست سخن کہ کس بہ ناکس گوید

جنگل سے گھنے خواب، حقیقت، رم شب
بوجھل گہرے خواب، حقیقت، رم شب
بستر کی ہر شکن پسینے میں تر
جسں بھرے خواب، حقیقت رم شب

بارش کا جوش ہے اڑا ہے سبزہ
ہے جوش نمو گونج رہا ہے سبزہ
پتی پتی پہ لکھوں نام نامی
وہ آنکھ نہ تر کرے تو کیا ہے سبزہ

اک شعلۂ نم، درد، جدائی تہہ خاک
گل شاخ کاخم، درد، جدائی تہہ خاک
اے ٹوٹتی سانسوں میں بکھرتی ہوئی رات
ہستی نہ عدم، درد، جدائی تہہ خاک

پے دستہ ہوس کا جنگل، شام، ہوا
رگ رگ میں ٹپکتا جنگل، شام، ہوا
اونچی چھت سے، نیل فلک کا منظر
خنجر سا نکیلا جنگل، شام، ہوا

اک سانولی ننھی بستی، باغ، خزاں
کیا بے خبری تھی، بستی، باغ، خزاں
کچھ دھوپ دمکنے کا تو موقعہ دیتی
اک شب لے گزری بستی، باغ، خزاں

شمس الرحمٰن فاروقی

برف باری

زمستاں کی رت، نیم شب، برف باری
یہ حد نظر تھرتھراتی ہوئی لو
فضائے دل و جاں کی شبنم گزاری
درخشاں رفتہ ہواؤں کی زد پہ
خزاں دیدہ پتے سسکتے ہوئے سے
ٹھٹھرتی ہوئی چاندنی، کانپتی ضو
دریچوں کے شیشے درکتے ہوئے سے
کوئی چیخ، آواز، جھنکار، نغمہ
روانی خون گلو تھم رہی ہے
کریدو! انگیٹھی کا سینہ کریدو
مری آگ پر راکھ سی جم رہی ہے

شاذ تمکنت

وہ حرف وصوت، وہ صدا

وہ حرف جو فضائے نیلگوں کی وسعتوں میں قید تھا
وہ صوت جو حصار خامشی میں جلوہ ریز تھی
صدا جو کوہسار کی بلندیوں پہ محو خواب تھی
ردائے برف سے ڈھکی
وہ حرف جو ہوا کے نیلے آنچلوں سے چھن کے
جذب ہو رہا تھا ریگ زار وقت میں
جو ذرہ ذرہ منتشر تھا
دھندلی دھندلی ساعتوں کی گرد میں
وہ معنی گریز پا لرز رہا تھا جو رگ حیات میں
وہ رمز منتظر کہ جو ابھی نہاں تھا بطن کائنات میں
وہ حرف وصوت، وہ صدا
وہ لفظ منتشر،
وہ رمز منتظر،
وہ معنی گریز پا،
بس ایک جست میں حصار خامشی کو توڑ کر
پگھل کے میرے درد و آرزو کی آنچ میں
وہ میرے نطق کی صباحتوں میں ڈھل گیا
وہ آبشار نغمہ و نوا، کہ کوہسار سرد سے گرا
کہ گونجتی گپھاؤں سے ابل پڑا
وہ جوئے ذات نغمۂ حیات، جو رواں دواں ہے، بحر بیکراں کی کھوج میں

زاہدہ زیدی

بھر جاؤں گا میں

نقش جاں میں بے حسی کا رنگ بھر جاؤں گا میں
زندگی! کیا تیری خاطر یہ بھی کر جاؤں گا میں

میں ہوا کا ہم سفر، منزل کہاں میری، مگر
تم جہاں آواز دے لوگے، ٹھہر جاؤں گا میں

سمٹا سمٹا چل رہا ہوں دن کی انگلی تھام کر
رات کے سینے پہ سر رکھ کر بکھر جاؤں گا میں

اس سفر میں آئیں گے کچھ موڑ ایسے بھی کہ جب
اپنی پرچھائیں سے خود بچ کر گذر جاؤں گا میں

آہی نکلا ہوں تو کچھ لیتا چلوں بازار سے
گو سمجھتا ہوں کہ خالی ہاتھ گھر جاؤں گا میں

دور تک پیچھا کرے گی تیری قربت کی یہ شام
سامنے ہوگا یہی منظر جدھر جاؤں گا میں

آسماں کی چھت تلے، پھیلی زمیں پر سو نہ جاؤں
شب کے زنداں سے نکل کر کس کے گھر جاؤں گا میں

محمود سعیدی

میزان میں رکھو

تول مجھ کو، مجھے میزان میں رکھ
میں علامت ہوں مجھے دھیان میں رکھ
تند ہوتی ہوئی ہر لحظہ ہوا
اس کو بھی اپنے ہی احسان میں رکھ
شہر اور گاؤں کو ویرانی دے
موسم گل کو بیابان میں رکھ
لوگ باتوں سے ہی ڈر جاتے ہیں
اپنی تلوار کو اب میان میں رکھ
منزل آخر شہرت کے سفیر
اپنے آغاز کو بھی دھیان میں رکھ
دھوپ کو کمرے کی مسند پہ بٹھا
شام کو چپکے سے دالان میں رکھ
صرف تعداد نہ دیواں کی بڑھا
چند اشعار بھی دیوان میں رکھ

مظہر امام

جاتے کہاں کہاں

تاریک زمہریر میں جاتے کہاں کہاں
شعلۂ نفس تھے، آگ لگاتے کہاں کہاں
خود بھی وہ تیرہ رو در ہواؤں کی زد میں تھے
شب دشت ہو چراغ جلاتے کہاں کہاں
خوں تشنہ سایہ برگ بدن سے چپک گئے
رستے میں اپنی خیر مناتے کہاں کہاں
آوارہ بادلوں کی طرح بے مقام تھا
تپتی زمیں پہ آنکھیں بچھاتے کہاں کہاں
تا صبح موج موج تلاطم صدا رہے
خوابیدہ ساحلوں کو جگاتے کہاں کہاں
کتنے ہی برف پوش کہکشاں نظر میں تھے
اپنے بدن کا بوجھ اٹھاتے کہاں کہاں
دیکھا وہاں بھی چھائی تھیں بیخبر خموشیاں
برگ و نوا سے دھوم مچاتے کہاں کہاں

حامدی کشمیری

لاٹ کے جنگل میں پھنسی نسل

توازن کی خواہش، بڑا جرم ہے
آج کی اتھلی پتھلی زمیں پر
قدم ڈرتے ڈگمگاتے
پریشان روحوں کے اس کارواں سے
نہ منزل ہو جس کی، نہ کچھ ابتدائے سفر کا نشاں
سر پہ کالا دھواں
لاٹ کے جنگل میں پھنسی سانس
کب اپنی انگلی چھڑالے
کسے ہے پتہ؟
ایسے عالم میں
جو ایک خالی صفر سا تنا
سر پہ حاوی ہے
کیوں میرے خوابوں کو TAPE آزمائی کا دکھ دے رہے ہو
توازن کو اگلے زمانے کی دستار پہ
سبز کلغی تھا جو
آج Research کا مسئلہ ہے
مجھے صرف اتنا بتا دو کہ آگے کی ساری زمینیں
ہوائیں، فضائیں، خلائیں
بلاؤں
اپنی استلاؤں سے خالی ملیں گی

وہاب دانش

لب کچھ بھی نہیں

سانس اکھڑی ہوئی سوکھے ہوئے لب کچھ بھی نہیں
پیاس کا نام ہی روشن ہے بس اب کچھ بھی نہیں

سر احساس پہ دستارِ فضیلت نہ رہی
بس کہ اب سلسلۂ نام و نسب کچھ بھی نہیں

گل امکان نہ سرسبز کوئی برگ امید
یعنی اب کے تو سرِ شاخ طلب کچھ بھی نہیں

صبح تک پھر بھی نہیں، بجھتے ہیں آنکھوں کے چراغ
جانتا ہوں کہ پسِ پردۂ شب کچھ بھی نہیں

بے تعلق رہے برسوں تو کوئی بات بھی تھی
ان دنوں تم سے نہ ملنے کا سبب کچھ بھی نہیں

وضع داری ہی بکھرنے نہیں دیتی اختر
ورنہ ہم ٹوٹے ہوئے لوگوں میں اب کچھ بھی نہیں

سلطان اختر